مطالعۂ اسلام اور استشراقی تنقیدات: تحقیق و تجزیہ

(Orientalists' Approach towards Islamic Studies: Assessment and Evaluation)

محمد شہباز منج *
محمد فیروزالدین شاہ کھگہ *

Abstract

Orientalist by term means a non-oriental scholar who devotes himself to oriental Learning especially to Islam. Orientalism by term means an organized movement operated by Europeans, in general, and especially by the Christians and Jews in particular to study orient, particulary Muslims; their religion, languages, literature, culture and civilization etc. Orientalists study all this, generally, to deduce negative and subjective conclusions, pretending that they are studying objectively. Though, Jew's and Christian's hatred for Islam, the Prophet Muḥammad (peace be upon him) and Muslims had been pronounced from very early days of Islam, yet the Crusades made their patrimonial hostility more intense. In the beginning this animosity almost had only the mode of abuse and denunciation, an attitude, generally adopted by the defeated enemy against the successful enemy. But afterward, when Europeans prevailed politically and materialistically, this antagonism became a science. On the name of scientific research the task of flinging mud on Islam and the prophet of Islam was undertaken. These research activities were assisted and abetted by the governments for achieving various religious, political and economic objectives. A number of Muslim scholars and leaders came under the spell of orientalists and began to harp the same tune. However the constant efforts of renouned Muslim scholars were successful in unrevealing the real nature and goals of the Orientalists and disinfecting their perversions.

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا۔
* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا۔

مستشرقین اور تحریک استشراق کا مفہوم:

لغوی مفہوم :

عربی اور اردو لغات اور لٹریچر میں مستشرق اور استشراق کے الفاظ زیادہ پرانے نہیں بلکہ یہ انگریزی کے الفاظOrientalist اورOrientalism جو کہOrient سے ماخوذ ہے، کا ترجمہ یا چربہ ہیں۔[1] لہذا سب سے پہلے انگریزی کے مذکورہ الفاظ کی لغوی تحقیق کی جاتی ہے۔لفظ Orient کے سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے :

"The Orient is a term popularly comoting all countries of east (including middle and near east) or of Asia generally."[2]

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میںOritental سے مراد لیا گیا ہے مشرقی، بحیرہ روم اور قدیم سلطنت روما کے مشرق میں واقع ممالک اور علاقہ جات اور وہاں کی تہذیب و خصوصیات سے متعلق، جنوب مغربی ایشیا یا مطلق ایشیائی ممالک سے متعلق۔ نیز جس کا تعلق مسیحی یورپ کے مشرق سے ہو۔[3] آکسفورڈ السٹریٹڈ ڈکشنری میںOriental کے زیر عنوان تحریر ہے :

"Of the orient, esp. Asiatic, occurring incoming from, the East, characteristic of its civilization etc"[4]

Orientalistکا مطلب لیا گیا ہے وہ شخص جو مشرقی زبانوں اور ادب سے واقفیت بہم پہنچائے یعنی مشرقی علوم کا ماہر۔[5] Orientalism کا معنی مشرقی خصوصیات، مشرقی رسوم و رواجات، مشرقی ثقافت و تہذیب، مشرقی زبانوں اور مشرقی اقوام سے متعلق علم و مہارت بیان کیا گیا ہے۔[6] علاوہ ازیں اس کی تعریف "Make, become Oriental" [7] بھی کی گئی ہے۔

عربی میں مادہ ش رق سے بذریعہ اشتقاق Orientalistاور Orientalism کے لیے علی الترتیب المستشرق اور الاستشراق کے الفاظ وضع کیے گئے ہیں۔المنجد میں مشرقی زبانوں اور علوم و آداب کے عالم کو المستشرق کہا گیا ہے۔[8] الرائد میں المستشرق کا مفہوم یہ بتایا گیا ہے۔

"علم أجنبي بحياة الشرق وعلومه وآدابه ولغاته وحصاراته ومدنياته".[9]

الاستشراق کا معنی مشرقی زبانوں اور علوم و آداب کا علم کیا گیا ہے۔[10] الرائد میں الاستشراق کے آگے درج ہے:

"علم الأجانب بحياة الشرق وعلومه وآدابه ولغاته وحضاراته ومدنياته".[11]

اردو میں Orientalist یا المستشرق کو مستشرق اورOrientalism یا الاستشراق کو استشراق یا مستشرقیت

کہا جاتا ہے۔ مستشرق کی تعریف "مشرقی تاریخ، تہذیب، زبان یا علوم و غیرہ کا مغربی ماہر" کی گئی ہے۔[12] جامع اللغات میں مستشرق کا مطلب لکھا ہے:

"ماہر شرقیات، وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو"[13]

یوں استشراق یا مستشرقیت سے مراد ہو گا مستشرق ہونے کی حالت۔علوم شرقیہ کی مہارت۔[14]

اصطلاحی تعریف:

مستشرق سے مراد عام طور پر وہ غیر مشرقی عالم لیا جاتا ہے جو مشرقی علوم کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے۔ڈاکٹر محمد احمد دیاب غیر مشرقی لوگوں کے مشرقی زبانوں، تہذیب، فلسفے، ادب اور مذہب کے مطالعہ میں مشغول ہونے کو استشراق قرار دیتے ہیں۔[15] ابراہیم عبدالمجید اللبان نے مستشرقین کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"المستشرقون اسم واسع يشمل طوائف متعددة تعمل في ميادين الدراسات الشرقية المختلفة، فهم يدرسون العلوم، والآداب الخاصة بالهند والفرس والصين واليابان والعالم العربي وغيرهم من أمم الشرق".[16]

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کے مطابق اصطلاحاً یا عرفاً یہ لفظ ان غیر مسلم علمائے مغرب کے لیے مخصوص ہے جو مشرقی زبانوں اور علوم و آداب میں دلچسپی لیتے ہیں،لیکن مشرق کی غیر مسلم زبانوں،غیر اسلامی علوم و فنون اور اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے مغربی عالم کو مستشرق نہیں کہا جاتا۔اس لحاظ سے مستشرق مغرب کے ان غیر مسلم خاص کر یہودی اور عیسائی علماء کو کہاجائے گا،جو اسلام، اسلامی علوم، اسلامی زبانوں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے مطالعہ میں خصوصی دلچسپی لیتے ہیں۔[17]

عربی زبان کی ایک اہم خصوصیت یعنی خاصیت ابواب کو سامنے رکھتے ہوئے استشراق کا مطلب لیا جاتا ہے۔بہ تکلف مشرقی بننا۔[18] اور مستشرق اس شخص کو سمجھا جاتا ہے، جس نے بہ تکلیف مشرقیت اختیار کی ہو۔ Edward W. Said کے خیال میں استشراق یا مستشرقیت کی اصطلاح تعلیمی اداروں پر ایک لیبل کے طور پر استعمال ہوتی ہے،اور مستشرق اس شخص کو کہتے ہیں، جو مشرقی تمدن و تہذیب کے بارے میں پڑھاتا، لکھتا اور تحقیقات کرتا ہو۔یوں یہ لفظ انتھراپالوجسٹ، سوشیالوجسٹ اور ماہر تاریخ کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اور ان لوگوں کی ان مساعی کو استشراق یا مستشرقیت کا نام دیا جاتا ہے۔[19]

مشرق کے لفظ کے تناظر میں استشراق اور مستشرقین کی تعریف میں بالعموم مشرق ومغرب کی ایک خاص تقسیم کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔لیکن بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ شرق و غرب کی یہ تقسیم غیر

حقیقی، اعتباری اور اضافی ہے۔[20]
چنانچہ کچھ اہل علم کے نزدیک مستشرقین کے عرف میں لفظ "مشرق" کا جغرافیائی مفہوم مراد نہیں بلکہ ان کے نزدیک مشرق سے زمین کے وہ خطے مراد ہیں جن پر اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔[21] گویا مستشرقین اسلامی ممالک اوردنیائے اسلام کو مشرق کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں،ورنہ تو مسیح علیہ السلام اور عیسائیت اور بائبل کے اکثرواقعات کا تعلق بھی مشرق سے بنتا ہے، لیکن ان سے متعلق علم کے کسی ماہر کو مستشرق نہیں کہا جاتا۔بنابریں مستشرقین اور استشراق کی جامع تعریف وہی ہو گی جس میں اہل مغرب کے مشرقی علوم کے سلسلہ میں مطالعات میں اسلام اور مسلمانوں کا خصوصی حوالہ ہو۔
ڈاکٹر احمد عبدالحمید غراب نے استشراق اور مستشرقیت کی وضاحت کے حوالے سے متعدد تعریفات نقل کرنے کے بعد اپنی طرف سے ایک جامع تعریف پیش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مغربی اہل کتاب عیسائی مغرب کی مسلم مشرق پر نسلی اور ثقافتی برتری کے خود ساختہ تصور کی بناپر مسلمانوں پر اہل مغرب کا تسلط قائم کرنے کی غرض سے مسلمانوں کو اسلام کے بارے میں گمراہی اور شک میں مبتلا کرنے اور اسلام کی مسخ شدہ تصویر پیش کرنے کی خاطر مسلمانوں کے عقیدہ، کلچر، شریعت، تاریخ، نظام اور وسائل و امکانات کا جو مطالعہ معروضی تحقیق کے دعوے کے ساتھ کرتے ہیں،اسے استشراق کہا جاتا ہے۔[22]
اس میں شبہ نہیں کہ مستشرقین اسلام کے حوالے سے بہت جارحانہ عزائم رکھتے ہیں اورمذکورہ بالا تعریف میں ان کے ان عزائم کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔تاہم یہ حقیقت پیش نظر رہنا چاہیے کہ مطلق حیثیت میں مستشرقین اور ان کی سرگرمیوں اوردلچسپیوں میں خاصاتنوع ہے۔یہی وجہ ہے کہ مختلف محققین نے استشراق اور مستشرقین کی مختلف اور متعدد تعریفات بیان کی ہیں۔[23] بنا بریں تمام مستشرقین کو ایک ہی زمرے میں شمار کرنا درست نہیں۔کئی مستشرقین ایسے ہیں جو دیگر مشرقی علوم اور تہذیبوں پر اور بعض دیگر مقاصد کے پیش نظر کام کرتے ہیں۔چنانچہ مطلقاً یہ کہنا کہ تمام مستشرقین اسلام کے خلاف منفیانہ رویہ ہی کے تحت سرگرم عمل ہیں،حقیقت سے بعید ہے۔ہاں اگرکچھ مستثنیات رکھ دی جائیں اور اسلام کے حوالے سے کام کرنے والے بیشتر مستشرقین کے رویہ کے تناظر میں اختصاص کے ساتھ بات کی جائے تومذکورہ بالا تعریف البتہ جامع بن سکتی ہے۔اس لحاظ سے مستشرقین اور استشراق کی جامع اصطلاحی تعریف یوں کی جا سکتی ہے:

"اہل مغرب عموماً اور یہودی و عیسائی خصوصاً جو مشرق بالخصوص مسلم مشرق پر اپنی مزعومہ نسلی وثقافتی برتری کے تخیل کے تحت مسلمانوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کی غرض سے مسلمانوں کو اپنے مذہب، عقائد، زبانوں، ادب، تمدن و تاریخ اور وسائل وامکانات وغیرہ کے حوالے سے موضوعی منفی نتائج سامنے لا کر شکوک وشبہات اور احساس کہتری میں مبتلا کرنے کی غرض سے ان کے مذہب، عقائد، زبانوں، ادب، تمدن و تاریخ اور وسائل وامکانات وغیرہ کا مطالعہ معروضی تحقیق کے دعوے کے ساتھ کرتے ہیں، مستشرقین ہیں اور جس تحریک سے یہ وابستہ ہیں وہ تحریک تحریک استشراق ہے۔"

اسباب اور تاریخی پس منظر-اسلام کا طلوع و عروج اور اہل کتاب کا معاندانہ رویہ:

یہود و نصاری ابتدائے اسلام ہی سے اسلام اور مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتے رہے ہیں۔یہ دشمنی تاریخ کے کسی دور میں ختم نہیں ہوئی ہاں البتہ اس کے رنگ اور شکلیں بدلتی رہی ہیں۔یہودیت و عیسائیت اور اسلام کے درمیان معاندانہ تعلقات اور کھلی کشمکش کو خود مغربی مصنفین نے تسلیم کیا ہے۔ R.C. Zaehnerاور Lootfy Levonian نے اسلام اور عیسائیت کے درمیان تاریخی مخاصمت کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔[24] اہل مغرب اپنی اسلام دشمنی کو اپنے زعم باطل میں تاریخی جواز فراہم کرنے کے لیے آنحضورؐ کی ولادت باسعادت ہی کو مسیحیت کے زوال و انحطاط کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ Thomas Wrightابرہہ کے حملے کے دو ماہ بعد حضورؐ کی پیدائش کو عیسائیت کے لیے بد ترین آفت قرار دیتے ہوئے رسول اکرم ﷺ کو مسیحیوں کا سب سے بڑا دشمن گردانتاہے۔[25] فلپ کے ہٹی اسلام اورعیسائیت کے درمیان کشمکش کے نقطہ آغاز کا سراغ لگاتے ہوئے جنگ موتہ تک پہنچتا ہے۔وہ الزام لگاتا ہے کہ یہ جنگ نبی کریم ﷺ نے شروع کی تھی۔ اس کے الفاظ ہیں:

> "He fired the opening shot in the conflict between Christendom and Islam which was to rage through the centuries".[26]

گبن تاریخی حقائق کو مسخ کر کے پیش کرتے ہوئے موتہ کی فوجی مہم سے متعلق رقمطراز ہے :

> "The murder of an envoy afforded a decent pretest for invading, with three thousand soldiers the territory of Palestine."[27]

چارلس ملز کے خیال میں جنگ موتہ انتقام لینے کی ایک خواہش تھی تاکہ شام جیسے امیر ملک سے لوٹ کھسوٹ کی جا سکے۔[28]

اس تاریخی بحث سے قطع نظر کہ جنگ موتہ سے متعلق مستشرقین کے مذکورہ بالا اور اس طرح کے دیگر لاتعداد بیانات میں کیا کیا غلطیاں ہیں اور ان میں حقائق کو کس قدر توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، سر دست یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہودی و عیسائی اہل قلم نے اپنے ہم مذہب لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اکسانے میں کبھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وہ تاریخی حقائق کو مسخ کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان شروع دن ہی سے یہودیوں اور عیسائیوں کے دشمن ہیں اور مسلمانوں نے ہمیشہ جارحیت کا ارتکاب کیا ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کے تعصب و تنگ نظری اور دشمنی و مخاصمت کا تاریخی تناظر میں ذرا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام جب تک جزیرہ عرب کے اندر رہا عیسائیوں نے اسے اپنے لیے کوئی بڑا خطرہ نہ سمجھا۔ لیکن جب اسلام انتہائی سرعت سے پھیلتے ہوئے عرب کی سرحدوں سے باہر نکلنے لگا، جب اس نے جزیرہ عرب کے اندر اپنے تمام مخالفین کو نہ صرف ختم کیا بلکہ ان کی اکثریت کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا، جب عرب کے عیسائی قبائل عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کرنے لگے تو عیسائی حکمرانوں نے اسلام کے خلاف فیصلہ کن کاروئی کرنے کا تہیہ کر لیا- وہ اسلام کی اشاعت کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر کھڑے ہو گئے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جنگوں کا ایک وسیع سلسلہ چل نکلا۔ مسلمانوں نے عیسائی فوجوں کو فاش شکستیں دیں اور ان کے بہت سے علاقوں کو فتح کر لیا۔ مسلمانوں کی عیسائیوں کے خلاف فتوحات صرف عسکری ہی نہیں تھیں بلکہ اخلاقی و روحانی بھی تھیں۔ انتہائی قلیل مدت میں اسلام نے ایشیاء اور افریقہ سے عیسائیوں کے سیاسی اور روحانی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ ان کے پوپ اور پادری اس صورت حال کو انتہائی بے بسی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ان کی صدیوں کی تبلیغی اور تبشیری کوششیں اکارت ہو رہی تھیں۔ ان کا سیاسی و روحانی مستقبل تاریک ہوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ چنانچہ ان کے دل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت سے معمور ہو گئے۔ ان میں انتقام کی چنگاریاں سلگنے لگیں۔ جب مسلمانوں کو سیاسی زوال آیا تو عیسائیوں نے ماضی کی شکستوں کے دل کھول کر بدلے لیے لیکن انتقام کی جو چنگاری ان کے دلوں میں سلگ رہی ہے اس کی حدت میں ہنوز کمی نہیں آئی۔[29]

صلیبی جنگوں کے طویل سلسلہ پر نظر ڈالی جائے تو مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کے بغض و عناد اور جارحانہ عزائم کی بہت حد تک نقاب کشائی ہو جاتی ہے۔ صلیبی جنگوں میں عیسائیوں نے لاکھوں جانیں قربان کیں۔ ان کے بڑے بڑے قائدین کام آئے۔ لیکن بایں ہمہ وہ مسلمانوں کو دبا سکے اور نہ ہی بیت

المقدس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مسلسل ناکامیوں کے پیش نظر انہوں نے مسلح تصادم کی بجائے مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے دوسرے حربے استعمال کرنے شروع کیے۔انہیں یقین ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کی قوت کا راز ان کے دین کی تعلیمات میں پنہاں ہے اور ان کو کمزور کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ دین اسلام اور داعی اسلام کی ایسی تصویر پیش کی جائے کہ مسلمانوں کو مسلمان کہلاتے ہوئے شرم محسوس ہو۔چنانچہ انہوں نے تیغ و سناں رکھ دیے اور قلم و قرطاس کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے۔انہوں نے ڈراموں، فلموں، کارٹونوں اور کتابوں میں اسلام اور داعی اسلام کے کردار کو مسخ کر کے پیش کرنا شروع کر دیا۔اس مقصد کے لیے انہوں نے کئی روپ دھارے، جن میں ایک روپ استشراق کا ہے۔ایک مستشرق کے عزائم بعینہ وہی ہیں جو صلیبیوں کے تھے۔فرق صرف طریق کار کا ہے۔مسلمان صلیبی دشمن کے روپ میں مشرق میں آئے تھے۔لیکن مستشرق علم دوست اور مشرقی علم و ثقافت، تہذیب و تمدن اور دین و مذہب کے حقائق کا جوئندہ بن کر مشرق میں آتا ہے اور پھر اپنے قلم کے زور اور تخیل کی پرواز سے اسلام اور مسلمانوں کو قتل کرتا ہے۔[30]

مسلمانوں کا سیاسی زوال اور عیسائیوں کا جوش انتقام:

جب عرب کمزور ہو گئے اور عثمانی ترک بھی زوال کا شکار ہونے لگے تو یورپ والوں نے جارحانہ انداز اپنالیا۔جنگوں کا بدلہ لینے کی خواہش اہل مغرب کے اعصاب پر سوار ہوگئی۔اس سلسلہ میں مسلمانوں کے بارے میں اہل مغرب کے خوفناک جذبات سے متعلق Kirby Page کا یہ بیان قابل ملاحظہ ہے:

> "It is almost impossible for modern Christians to appreciate the depth of emotion which swept over medieval Christendom at the thought of the tomb of Christ being in hands of Mohammedans. The vilest of the calumnies against the Muslims were blindly received by the credulous members of the church. No tale of inhumanity was too horrible to be accepted".[31]

ڈاکٹر مصطفی سباعی کے مطابق جب عالم اسلام فوجی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے تنزل و انحطاط کے مراحل سے گزر رہا تھا تو یورپ میں مسلمانوں پر سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے احساس نے کروٹ لی ۔مغربی عیسائیوں نے یکے بعد دیگرے عالم اسلام کے ایک ایک شہر کو ہوس استعمار کا نشانہ بنایا۔ابھی عالم اسلام کے اکثر دیار و بلاد پر یورپین عیسائیوں کو مکمل سیاسی غلبہ حاصل نہ ہوا تھا کہ اسلامی علوم اور تاریخ سے متعلق اہل یورپ کے نقد و جرح اور تنقید و تبصرہ میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ڈاکٹر صاحب موصوف کا کہنا ہے کہ یورپ کی تحریکِ استعمار اور تحریک استشراق کے مقاصد ایک ہی ہیں۔موئخرالذکر

کے ذریعے بھی وہ درحقیقت اپنی ہوس استعمار کو شہ دینا چاہتے ہیں۔[32]

ظفر علی قریشی نے مسلمانوں کے خلاف اہل مغرب کے جوش انتقام کے محرکات اور اس سلسلہ میں ان کی انتقامی استشراقی حکمت عملی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عیسائیوں نے بہت سے علاقوں کو ہاتھ سے گنوا بیٹھنے کو کبھی فراموش نہیں کیا اور نہ ہی کبھی مسلمانوں کو معاف کیا۔ مسلمانوں کی فتوحات کے علاوہ بھی کئی محرکات ایسے سامنے آتے رہے جن سے مغرب والوں کا غیض و غضب بڑھتا ہی رہا۔ سپین اور سسلی سے مسلمانوں کو مکمل طور پر نکالنے میں ناکامی، مغربی شہنشاہیت کے مرکزی علاقوں میں مسلمانوں کا مغرب کے مزاحمت پر ثابت قدمی سے ڈٹے رہنا، مغرب کی غلامی سے آزادی کے لیے مسلمانوں کی غیر متزلزل، پختہ، ثابت قدم اور کبھی نہ ختم ہونے والی جدو جہد، اہل مشرق سے بدلہ لینے میں اہل مغرب کی مایوسی سے بھری ہوئی ناکامی اور اہل مغرب کی اجارہ داری کی ہتھکڑیوں کو اتار پھینکنے کی موجودہ جدو جہد وغیرہ، سبھی محرکات نے اہل مغرب کے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے جذبات کو مزید برانگیختہ کر دیا۔ یہ تلخی اور دشمنی بڑھتی ہی چلی گئی۔ چنانچہ انہوں نے غصے میں انتقام کی یہ راہ اختیار کی کہ اسلام اور داعیٔ اسلام کے بارے میں حقائق کو اپنے مقصد کی خاطر غلط رنگ میں رنگ دیا۔[33]

اہل مغرب نے جوش انتقام میں مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کو حد درجہ مشتعل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ نفرت اور خوف و ہراس مسلمانوں کے ساتھ اس طرح منسوب کر دیا گیا کہ مسلمان جبر و تشدد کی علامت کے طور پر مشہور ہو گئے۔ یہ ذہنی اشتعال اس قدر گہرا تھا کہ صدیاں گزرنے کے باوجود اس کا اثر ختم نہیں ہو سکا۔ عیسائیوں نے اپنے ہاں اسلام اور مسلم دشمنی کو تازہ رکھنے کے لیے یہ موقف اختیار کر لیا کہ صلیبی جنگیں ابھی ختم نہیں ہوئیں۔ مسلمانوں کے خلاف ہر اقدام کو صلیبی جنگوں کے تسلسل کا نام دیا گیا۔ یوں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ چھیڑ دی گئی۔ مسلمانوں سے بدلہ لینے کی خواہش ہر دور میں تسلسل کے ساتھ موجود رہی ہے، اور اب بھی موجود ہے۔ مستشرقین نے خود اس بات کی وضاحت کی ہے کہ صلیبی جنگیں اب بھی جاری ہیں۔ Hendrik Van Loon کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

> "...the followers of the two great teachers who were such close relatives have always recognized each other with bitter scorn and have fought a war which has lasted more than twelve centuries and which has not yet come to an end."[34]

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے پہلی جنگ عظیم میں اتحادی فوجوں کے بیت المقدس پہنچنے پر لارڈ ایلینبی کا وہ مشہور فقرہ نقل کیاہے، جس کے مطابق صلیبی جنگیں اگرچہ فوجی حیثیت سے ختم ہو گئیں تاہم دین اسلام اور

اس کی تہذیب و حضارت سے متعلق اہل مغرب کا مسلمانوں سے تحریری معرکہ ہنوز جاری ہے، اور دینی تعصب کے اثرات اہل مغرب کی اسلام سے متعلق تصنیفات میں اب بھی موجود ہیں۔[35]

اسلامی علوم سے متعلق اہل مغرب کا تعصب اور بھی زیادہ شدت سے اس وقت سامنے آنے لگا جب انہوں نے نہ صرف فوجی و عسکری اعتبار سے عالم اسلام کو اپنی ہوسِ استعمار کا نشانہ بنایا بلکہ سائنسی میدان میں بھی ترقی کے زینے طے کر لیے۔ اب انہیں ایک احساس برتری ہو گیا۔ وہ اسلام اور اہل اسلام کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ڈاکٹر سباعی کے بقول اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ نے جو مادی اور علمی ترقی کی اس کی بنا پر وہاں کے علماء و مورخین مغرور ہو گئے۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ مصری تہذیب کو نکال کر مغربی تہذیب سب تہذیبوں کی اصل و اساس کا حکم رکھتی ہے۔ ان کے خیال میں مغربی عقل بڑی دقیقہ رس اور منطقی انداز میں فہم و ادراک پر قادر ہے، جبکہ دیگر اقوام موٹی عقل کی مالک ہیں، اور ان میں باریک بینی اور ژرف نگاہی کا وصف نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ مشہور مستشرق گب نے اپنی کتاب وجہۃ الاسلام میں انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ گب دراصل یہ کہنا چاہتا ہے کہ اہل اسلام جزئیات کے واسطہ سے امورو اشیاء کا ادراک کرتے ہیں، براہ راست کلیات کے ادراک سے قاصر ہیں۔ مغربی علماء نے یہ فیصلہ اس وقت صادر کیا جب اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مفتوحہ اقوام نہایت کمزور، جہالت زدہ اور زندگی کے ہر گوشہ میں پسماندہ ہیں۔[36]

مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یہود ونصاریٰ کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں روز اول سے جاری ہیں، لیکن صلیبی جنگوں کے بعد ان سازشوں نے انتہائی گھناونی شکل اختیار کر لی اور یورپ کی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اہل مغرب کے ہاں اسلام دشمنی ایک باقاعدہ سائنس بن گئی۔ علمی تحقیق کے نام پر اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف کیچڑ اچھالنے کا بیڑہ اٹھا لیا گیا اور اسلام کی شکل مسخ کرکے مسلمانوں کے دلوں میں اپنے دین کی وقعت کم کرنے کی سر توڑ کوششیں شروع کر دی گئیں۔ اس کام کی سر پرستی باقاعدہ طور پر حکومتوں کی طرف سے بھی گئی۔ تا کہ اس طریقہ سے حکومتوں کے استعماری عزائم کی تکمیل ہو سکے۔ یوں ایک خاص ذہنی پس منظر میں مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے ایک منظم تحریک "تحریک استشراق" شروع ہوئی۔

تحریک استشراق کا نقطۂ آغاز:

آربری کے مطابق Orientalist کا لفظ پہلی مرتبہ 1630ء میں مشرقی یا یونانی کلیسا کے ایک پادری کے لیے استعمال ہوا۔[37] یورپی زبانوں میںOrientalism کا لفظ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں رائج ہوا۔

تحریک استشراق کے آغاز سے متعلق مختلف محققین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض کے خیال میں یہ تحریک دسویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی۔ وہ اس سلسلہ میں فرانسیسی راہب جریردی اورالیاک(1003-938) کا نام لیتے ہیں، جس نے حصول علم کے لیے اندلس کا رخ کیااور اشبیلیہ اور قرطبہ کی جامعات سے تعلیم حاصل کرکے عربی زبان و ادب کے عالم کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ یہ شخص999ء سے 1003ء تک سلفسترثانی کے لقب سے پاپائے روم کے منصب پر بھی فائز رہا۔[38] بعض اس کی ابتدا تیرہویں صدی عیسوی سے مانتے ہیں۔[39] بعض کے نزدیک اس کی ابتدا1312ء میں فینا میں منعقدہ کلیسا کی کانفرنس میں یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان کی تدریس کے لیے باقاعدہ(Chairs) قائم کرنے کے فیصلے سے ہوئی۔[40]

حقیقت یہ ہے کہ تحریک استشراق کو یہ نام اگرچہ صدیوں بعد ملا تاہم اس کا آغاز بہت پہلے یعنی آٹھویں صدی عیسوی میں ہو گیا تھا۔ اہل تحقیق کے مطابق یوحنا دمشقی (749-676عیسوی) کی مساعی کو تحریک استشراق کا نقطہ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس شخص نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف نفرت و دشمنی کی غرض سے تحریری مناظرات شروع کیے۔[41] اس نے اسلام کے خلاف دو کتابیں "محاورہ مع المسلم" اور "ارشادات النصاری فی جدل المسلمین" تحریر کیں[42] جان آف دمشق نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اسلام کے خلاف تحریک چلائی۔ اس نے اسلام کو وثنی(Pagan) مذہب قرار دیا اور کعبہ کو بت سے تعبیر کیا۔ چونکہ اسلام کا چہرہ مسخ کے لیے آنحضرت کی شخصیت و دعوت کی تمسیخ ضروری تھی، اس لیے اس نے آپ ﷺ کی حیات طیبہ اور سوانح پر حملہ شروع کیا۔ آپ کی نبوت کا انکار کر کے آپ کو دیو مالائی قصوں کا ہیرو بنا دیا۔ داستان سازی کے اس صنعت خانے میں آنحضورؐ کے بارے میں طرح طرح کے افسانے اور مضحکہ خیز وثنی خرافات گھڑے گئے۔ یہی کہانیاں لاطینی یا بیزنطینی تاریخ اور بعد میں چرچ کی اسلامی تاریخ کا حصہ اور مستشرقین کی اسکالر شپ کا مصدراصلی بن گئیں۔ جان اور اس کے پیرووں نے حضورؐ کو(نعوذباللہ) بے دین اور نبی کاذب اوراسلام کو ایک فاسد دین قرار دیا۔ اس نے آپ ؐپر ایک پادری کی معیت میں بائبل کو مسخ کر کے اسلام نام کا ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کا الزام عائد کیا۔ جان وہ پہلا مسیحی مشرقی مشنری تھا جس نے آنحضرتؐ کی مقدس شخصیت پر جنسی اتہامات کا طومار کھڑا کیا، جو بعد میں مغربی سکالرز کی تحقیق و ریسرچ کا دلچسپ موضوع بن گیا۔ اس نے زینب بنت جحش اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے واقعہ کو ایک افسانہ بنا دیا۔ یہی افسانے یورپ میں کلاسیکی موضوعات بن گئے، اور آج تک مستشرقین کے محبوب عناوین ہیں۔ ساتھ ہی جان نے تعدد

ازواج، طلاق اور اس قسم کے دیگر مسائل کو اچھالا جو اس کی کتاب De Haeresibus کے آخری باب کے اہم موضوعات ہیں۔[43]

ارتقائی تاریخ:

جان کے پیروؤں نے اس کی دی ہوئی بنیادوں پر اسلام دشمن لٹریچر کا انبار لگا دیا۔یہی لٹریچر مغربی سکالرز کے لیے از منۂ وسطی سے لیکر بیسویں صدی تک مصادر کا کام دیتا رہا۔اسی اسلام دشمن ادب میں ایک مشہور رسالہ،جو یورپ میں ازمنۂ وسطی کی سکالرشپ کو غذا فراہم کرتا رہا، عبدالمسیح بن اسحاق الکندی کی طرف منسوب ہے۔ولیم میور نے اس رسالہ کا تلخیصی ترجمہThe Apology of Al-Kindi کے نام سے 1887ء میں لندن سے شائع کیا۔یہ رسالہ مستشرقین کی خصوصی دلچسپی کی چیز رہا۔اس کے مرکزی مضامین میں آنحضورؐ کی نبوت کا انکار، قرآن کا مذاق،سیرت محمدیؐ کو جنس اور جنگ سے ملوث کرنا اور دیگر خرافات شامل تھے۔اس رسالہ کا اثر مستشرقین پر اتنا گہرا رہا کہ انیسویں صدی کی سکالرشپ سائنسی اور معروضی جرح و تعدیل کے تمام تر دعوؤں کے باوجود اس رسالہ کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکی۔[44]

آٹھویں صدی کے اواخر اور نویں صدی کے اوائل میں عروج اسلام پر تھیوسوفین نے کرانکل لکھی۔اس تاریخ کو اناسٹیس نے اپنی تاریخ چرچ کا حصہ بنا لیا۔یہ در اصل قرون وسطی میں شائع شدہ خرافات تھے۔اس میں موئلف نے اسلام کو یہودی یا عیسائی الاصل ثابت کرنے کی غرض سے، آنحضورؐ کو تعلیم یافتہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔نویں صدی عیسوی میں شاہ بیسل (867ء- 886ء) کی فرمائش اور حکم پر ایک بیزنطینی موئلف نے آنحضرتؐ کے خلاف ایک کتابRefutatio Muhammad تحریر کی،جس میں آپ کو (العیاذ باللہ) نبی کاذب اور قرآن کو خرافاتی داستانوں کا مجموعہ قرار دیا گیا۔مستشرقین کا سپین سے اٹھنے والا گروہ انہی مصادر کا پروردہ تھا۔قرطبہ کے پوپ(St Eulogius)،جو ایک عرصہ تک مسلم علماء کے ساتھ رہا اور مسلم کلچر کا مطالعہ کرتا رہا، نےاپنی تالیفLiber Apologetecus Marlirum کی بنیاد لاطینی مسودات و مخطوطات پر رکھی اور حضورؐ کے خلاف شدید نفرت کا مظاہرہ کیا۔اسی طرح ایک دوسرے اندلسی سکالر سان پیروڈو پاسکلSan Perodo Pascal نے اپنی تالیف،جو کہ کندی کے رسالہ کا چربہ ہے، میں اسلام کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کیا۔یوں نفرت وحسد کی یہ آگ بھڑکتی ہی چلی گئی۔Vincint de Beauvais متوفی 1264ء نے تمام داستانوں کو اپنی تالیف Specculam Historicaleمیں جمع کر دیا اور نہایت دریدہ دہنی سے کام لیتے ہوئے آپؐ کوpagan اور low bornثابت کرنے کی کوشش کی۔[45]

تحریک استشرق کی ارتقائی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے دیر کلونی اور پطرس محترم کا ذکر ازبس ناگزیر ہے۔ پطرس محترم فرانسیسی راہب تھا، جسے اسکی وسعت علمی کی بنا پر 1123ء میں دیر کلونی کا رئیس بنا دیا گیاتھا۔دیر کلونی کی بنیاد 910ء میں فرانس میں رکھی گئی تھی اور سپین سے علم حاصل کرنے والے کچھ راہبوں نے بارہویں صدی عیسوی میں دیر کلونی کو عربی ثقافت کی نشر واشاعت کا مرکز بنا دیا تھا۔[46] پطرس محترم نے ایک انجمن بنائی،جس کے ارکان ایک جماعت کی شکل میں ترجمے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ پطرس محترم نے کئی عربی کتب کے تراجم لاطینی زبان میں کرائے۔1143ء میں "رابرٹ آف تستر" نے قرآن حکیم کا لاطینی میں ترجمہ کیا،جس پر پطرس نے مقدمہ لکھا۔قرآن حکیم اور دوسری عربی کتابوں کے تراجم کی کوششوں کا جواز ثابت کرنے اور اسے اپنی ملت میں مقبول بنانے کے لیے پطرس کہتا ہے :

> "اگرچہ میری ان کوششوں سے مسلمانوں کو دین عیسوی میں داخل کرنا ممکن نظر نہیں آتا لیکن ایک عالم کا کم از کم یہ فرض تو بنتا ہے کہ وہ اپنے ان ہم مذہب بھائیوں کی مدد کے لیے کچھ نہ کچھ کرے،جو کمزور ہیں اور انہیں تھوڑی سی کوشش سے اپنے دین سے بدظن کیا جا سکتا ہے"۔[47]

پطرس ایک انتہائی متعصب اور کینہ پرور عیسائی تھا۔ اس نے اپنی اسلام دشمنی کو خفیہ نہیں رکھا، وہ اعتراف کرتا ہے کہ اس نے تراجم کا کام اسلام کی مخالفت کے لیے شروع کیا ہے،اور اس کا مقصد عیسائیوں کو دلائل فراہم کرنا ہے،تا کہ وہ اپنے ایمان اور عقیدے پر ثابت قدم رہ سکیں۔پطرس محترم کی نگرانی میں ہونے والے ترجمہ قرآن کو جس قدر مسخ کیا گیا تھا، اس کا اندازہ اس سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ "بلد شیر"،جس نے بیسویں صدی میں قرآن کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا،کہتا ہے کہ لاطینی عبارت چند مقامات کے علاوہ عربی عبارت سے کچھ مناسبت نہیں رکھتی۔لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ یہ ترجمہ بایں ہمہ عیسائیت میں مقبول رہا۔1543ء میں اسے شائع کیا گیا اور بعد میں قرآن حکیم کے مختلف یورپی زبانوں میں تراجم کے لیے یہ ترجمہ مصدر کا کام دیتا رہا۔[48]

راجر بیکن اور یمنڈ لل دونوں عالم نصرانیت کی توسیع کے لیے مسلمانوں کو عیسائی بنانا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو ان کی اپنی زبان اور ان کے مروجہ علوم کے ذریعے بحث کر کے عیسائیت کی دعوت دی جائے۔ان دونوں کا خواب 1312ء میں فینا کی کلیسائی کونسل نے پورا کر دیا،جو اس بات پر متفق ہو گئی کہ پوپ کی یونیورسٹی کے علاوہ پیرس، آکسفورڈ، بولونیا اور سلمنکا کی یونیورسٹیوں میں بھی عربی

زبان کی تدریس کا بندوبست کیا جائے۔[49]
صلیبی جنگوں میں صلیبیوں کی شکست فاش کی وجہ سے،اس دوران اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شدید متعصبانہ اور زہر آلود لٹریچر پیدا کیا گیا۔اب نثری ادب کے ساتھ ساتھ شعری ادب بھی پوری قوت سے میدان مبارزہ میں اتر آیا۔شعراء نے اسلام کی تنقیص میں پوری قوت صرف کر دی۔فرانسیسی اور لاطینی نظم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔والٹر نے لاطینی میں اور الیگزنڈر نے فرانسیسی میں دل کھول کر رسول اکرم ﷺ کے خلاف لکھا۔

قرون وسطیٰ سے نشاۃ ثانیہ تک:

اٹلی کا مشہور شاعر دانتے (1265ء 1321ء) نہ صرف اٹلی کی نشاۃ کا جد امجد بلکہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا پیامبر بھی ہے۔ یہ قرون وسطی اور نشاۃ ثانیہ کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کی شہرہ آفاق نظم The Divine Comedy کو نشاۃ کا چراغ تصور کیا جاتا ہے۔اس کے نظم کی بنیاد کیا تھی؟ دوسرے محققین کے علاوہ میڈرڈ یونیورسٹی کے استاد پلاسیوس(Placious) نے 25سالہ دیدہ ریز محنت اور تحقیق سے ثابت کیا کہ اس نظم میں آنحضور ؐ کی احادیث معراج نیز ابن عربی کی فتوحات مکیہ اور المعری کی رسالۃ الغفران سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔لیکن ہمیں یہاں یہ دیکھنا ہے کہ اس مستشرق شاعر نے مختلف اسلامی مصادر تک رسائی رکھنے کے باوجود اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس بدبخت نے حضور اقدس کو عیسائیت میں تشتت و تفریق کا مجرم قرار دیا ہے اور جہنم میں مثلہ کردہ زیر عذاب دکھایا ہے۔نیز حضرت علیؓ اور حضور ؐ کے دوسرے اصحاب قدسی صفات کوروتے چلاتے مبتلائے عذاب ظاہر کیا ہے۔دانتے پر صلیبی جنگوں کا اثر اتنا گہرا تھا کہ اس نے اپنی شعری قوت سے پورے یورپ کو ہلا دیا۔اس نے نبی کریم ﷺ پر کیچڑ اچھالنے کے ساتھ ساتھ فاتح قدس صلاح الدین ایوبی کو بھی جہنم میں منافقین کے ساتھ مبتلائے عذاب دکھایا۔اسلام دشمنی کے اس مظاہرے کے بعد اس نے صلیبی شہسواروں کو جنت میں خوش و خرم بتا کر انہیں نام بہ نام خراج تحسین پیش کیا ہے۔[50]
دانتے کی شاعری نے مغربی جذبات میں آگ لگا ڈالی۔نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں اگرچہ دیگر مذاہب کے ساتھ انصاف ہو رہا تھا اور روشن خیالی و رواداری کی تحریکات سر اٹھا رہی تھیں، اسلام کی جانب مستشرقین کے رویے میں کچھ تغیر واقع نہ ہوا۔نشاۃ ثانیہ کا سارا دور قرون وسطیٰ کے خرافات کے زیر اثر رہا اور اس کی افسانوی اور دیو مالائی تعبیر ہوتی رہی۔اسلام سے متعلق جو مصادر سند کا درجہ رکھتے تھے،ان پر صلیبی اور بیز نطینی چھاپ پڑی ہوئی تھی۔اس پورے دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام ؐ کے خلاف نجس الفاظ استعمال کیے گئے۔یہ لوگ اسلام کو سب سے بڑی برائی اور حضور ؐ کو ہر برائی کا منبع سمجھتے تھے۔ان کا

عقیدہ تھا کہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف وہ جو چاہیں لکھیں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔اسلام کے بارے میں ان لوگوں کی معلومات کس پایہ کی تھیں ؟ ان کی شاعری اور ان کا لٹریچر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کس قدر بغض و عناد سے لبریز تھا؟ اس سلسلہ میں مولانا شبلی نعمانی نے فرانس کے مشہور مصنف ہنری دی کا ستری کے حوالے سے لکھا ہے کہ تمام داستانیں اور نظمیں، مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض و عناد سے بھری ہوئی ہیں۔جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں ان کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں۔ہر مسیحی شاعر مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا اور حسب ترتیب درجات ان کے تین خدا تسلیم کیے جاتے تھے، ماہوم یا ماہون یانافومیڈ (یعنی محامڈ) اور ایلپن اور تیسرا ٹرگامان۔ان کا خیال تھا کہ محمدؐ نے اپنے مذہب کی بنیاد دعوی الوہیت پر قائم کی اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمدؐ (وہ محمدؐ جو بت شکن اور دشمن اصنام تھا) لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا۔اسپین میں جب عیسائی مسلمانوں پر غالب ہوئے اور ان کو سرقوسطہ کی دیواروں تک ہٹا دیا تو مسلمان لوٹ کر آئے اور اپنے بتوں کو انہوں نے توڑ ڈالا۔اس عہد کا ایک شاعر کہتا ہے "ایلپن مسلمانوں کا دیوتا، وہاں ایک غار میں تھا،اس پر وہ پل پڑے اور اس کو نہایت سخت سست کہا اور اس کو گالیاں دیں اور اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اس کو سولی دی اور اس کو پائوں سے روندا اور لاٹھیوں سے مار مار کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور ماہوم کو (جو ان کا دوسرا دیوتا تھا) ایک گڑھے میں ڈال دیا،اس کو سور اور کتوں نے نوچ ڈالا۔اس سے زیادہ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہوئی۔اس کے بعد ہی مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے دیوتائوں سے معافی مانگی اور از سر نو تلف شدہ بتوں کو بنایا۔اسی بنا پر جب شہنشاہ چارلس سرقوسطہ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دیا کہ تمام شہر کا چکر لگائیں، وہ مسجدوں میں گھس گئے اور لوہے کے ہتھوڑوں سے ماہو میڈ اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا۔[51]

اس دور کے مستشرقین اسلام و پیغمبر اسلامؐ کے خلاف جس توہم و تعصب کا شکار تھے،بعد کے کئی مستشرقین نے اس کا پردہ چاک کیا ہے۔مشہور مستشرق منٹگمری واٹ لکھتا ہے کہ دنیا میں اسلام اور پیغمبر اسلام کی تصویر سب سے زیادہ مسخ کر کے پیش کی گئی ہے۔[52]فلپ کے ہٹی اعتراف کرتا ہے کہ مسیحیوں نے آنحضورؐ کو سمجھنے میں غلطی کی اور انہیں حقیر کردار کا مالک قرار دیا نیز آپ کی تصویر کشی (نعوذ باللہ) نبوت کے ایک جھوٹے مدعی اور دغا باز کے طور پر کی گئی۔اس تصویر کو بعد ازاں جنس پرستی، بد چلنی، خون آشامی اور قزاقی کے چمکدار رنگوں سے مزین کیا گیا۔حضورؐ کو دشمن مسیح ظاہر کیا گیا اور یہ تصور پیش کیا گیا کہ آپ کی نعش زمین و آسمان کے درمیان معلق ہے۔یہ افسانہ اتنا

مشہور ہوا کہ 1503ء میں جب ایک اطالوی نو مسلم مدینہ گیا تو حضورؐ کی نعش مذکورہ مقام پر نہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ دانتے نے حضورؐ کے جسم کو دو دھڑوں میں تقسیم کر کے جہنم کے نویں درجے میں پڑا دکھانے کی کوشش کی، جو ایسی ملعون روحوں کے لیے مناسب مقام ہے، جو مذاہب میں تفرقہ ڈالنے والی ہیں۔ مغربی قصہ گوئوں نے "Maumet" کو، جو لفظ محمد ﷺ کی بگڑی ہوئی ان چالیس شکلوں میں سے ایک ہے، جس کا ذکر آکسفورڈ ڈکشنری میں ہوا ہے، بت بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ لفظ پتلی اور گڑیا کا ہم معنی بن گیا۔ شیکسپئر نے Romeo and Juliet میں اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کیا۔ محمدؐ کے نام کی ایک اور بگڑی ہوئی شکل کو ازمنہ وسطی کے ایک گشتی ڈرامے میں ایک ایسی چیز کے طور پر پیش کیا گیا، جس کی پوجا کی جاتی تھی۔ یہ حقیقت کے ساتھ کتنا بڑا مذاق ہے کہ ایک بت شکن اور تاریخ انسانی میں توحید خداوندی کے سب سے بڑے پرچارک کو معبود بنا کر پیش کیا گیا۔[53] Keren Armstrong نے اہل مغرب کی اسلام دشمنی کی کہانی بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ اہل مغرب میں اسلام اور آنحضورؐ کے تصور کو جس طرح مسخ کر کے پیش کیا گیا اس کے متعلق تفصیلی حقائق و واقعات اور امثلہ ذکر کرنے کے بعد وہ لکھتی ہیں کہ مغرب میں آج بھی بعض لوگ یہ سن کر حیران ہوتے ہیں کہ مسلمان اسی خدا کی عبادت کرتے ہیں جس کی عبادت یہودی اور عیسائی کرتے ہیں۔ وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا "اللہ" بھی بت پرستوں کی دیویوں کی طرح ایک دیوی کا نام ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مسلمان محمدؐ کو وہی مقام دیتے ہیں جو عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس زمانے میں لوگ اسلام کے متعلق منصفانہ رویے اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس زمانے میں بھی ان کی اسلام دشمنی ظاہر ہوئے بغیر نہ رہتی تھی۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں انہی فرضی داستانوں کو دہرایا جاتا رہا ہے جو قرنوں سے یورپ میں مقبول چلی آتی تھیں۔[54]

متذکرہ بالا بحث سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مستشرقین کئی سو سال تک اسلام کے خلاف زہر اگلتے رہے ہیں۔ اور ان کا پھیلایا ہوا زہر آج کے یورپ کے قلوب و اذہان تک میں سرایت کر چکا ہے اور وہ معروضی تحقیق اور آزادی فکر ورائے کے دعوی کے باوصف ان مسموم اثرات سے آزاد نہیں ہو سکا۔

استشراق دور استعمار میں:

سترہویں صدی عیسوی استعمار کی صدی تھی۔ عالم اسلام بالعموم فرانسیسی، ڈچ اور انگریزی تسلط میں آچکا تھا۔ اب مغربی اقوام کا مسلمانوں کے ساتھ براہ راست میل جول ہوا۔ مستشرقین یورپی استعمار کے زیر تسلط ممالک میں آنے جانے لگے۔ اہل مغرب نے دنیائے اسلام کو اپنے استعماری پنجے میں کسنے کے لیے بڑی محنت سے منصوبہ بندی کی۔ انہوں نے حصول مقصد کے لیے مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے

جغرافیائی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی و معاشی حالات کا مطالعہ ضروری سمجھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ عالم اسلام کے کونے کونے میں علم و معرفت کے موتی بکھرے پڑے ہیں، جن میں قوموں کی تقدیر بدلنے کی صلاحیت ہے۔ چنانچہ وہ عالم اسلام سے علوم و فنون کے گنج ہائے گرامایہ اور صدیوں کی علمی و فکری کاوشوں کے خزانے لے اڑے۔ عربی زبان پڑھنے اور پڑھانے کی تحریک چلی۔ کیمبرج، آکسفورڈ، لندن اور پیرس میں عربی زبان اور مشرقی تمدن و تہذیب کو سمجھنے کے لیے مراکز قائم ہوئے۔ مسلمانوں کے علمی شاہپاروں کی اشاعت ہونے لگی۔ اور السنہ شرقیہ کی تدریس کے لیے تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں لایا جانے لگا۔ عالم اسلام میں علمی مہمات بھیجنے کا بندوبست ہوا اور اہل مشرق کے طرز حیات اور خصوصیات کو سمجھنے کے لیے متعدد ایشیائی سوسائٹیاں تشکیل دی گئیں۔ اس دور میں فرانس، ہالینڈ، جرمنی، انگلینڈ اور دوسرے یورپی ممالک میں بڑے مشہور مستشرق ظاہر ہوئے، جنہوں نے عالم اسلام پر مغربی استعماری تسلط قائم کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ سترہویں صدی میں جدید تحریکات کے زیر اثر اسلام کو سمجھنے کا جذبہ ضرور پیدا ہوا مگر لاطینی خرافاتی روایات سے گلو خلاصی کا جذبہ پیدا نہ ہو سکا۔ مارٹن لوتھر جو جدید یورپ میں اصلاحات کا مفکر اعظم تھا، اس سے اسلام سے متعلق نرم رویے کی توقع تھی مگر اس کے بالکل برعکس اس نے اسلام اور مسلمانوں کو حق کا دشمن گردانتے ہوئے اسلام کو ترکوں کا مذہب قرار دیا۔ لوتھر چونکہ چرچ اور پوپ پر حملہ آور ہوا تھا، اس لیے اس نے آنحضورؐ کو پوپ سے بھی زیادہ بد تر قرار دیا۔

اٹھارویں صدی میں مقابلۃً اسلام پر زیادہ لٹریچر تیار ہوا۔ اس صدی کی ابتداء میں ڈچ مستشرق ایچ ریلان (H. Relan) نے آنحضورؐ کی جانب رویہ میں کچھ نرمی پیدا کی اور اسلام کے ساتھ تاریخی انصاف کا مطالبہ کیا۔ اس کی چلائی ہوئی تحریک سے متاثر ہو کر کانٹ نے بھی حضورؐ کے حق میں نرم رویہ اختیار کیا مگر اس کے خلاف حملے شروع ہو گئے۔ تاہم اس زمانہ میں چونکہ یورپ پر جدت پسندی اور روشن خیالی کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لیے کچھ مصنفین نے اسلام کے متعلق کچھ کلمات خیر بھی کہنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ اس ضمن میں سیوری(Savery) کا نام لیا جا سکتا ہے، جس نے آنحضورؐ کو تاریخ کی غیر معمولی شخصیت قرار دیا، مگر وہ بھی ازمنۂ وسطی کی گرفت سے آزاد نہ رہ سکا، اور حضورؐ کو نبی ماننے سے انکار کر دیا۔ ایڈ ورڈ گبن نے رواداری کے دعویٰ کے باوجود اپنی کتاب تاریخ زوال روما میں آنحضورؐ کو نبی کاذب کہا۔ اسی صدی کی ایک اور شخصیت، جو انقلاب فرانس کے بانیوں میں سے ہے، والٹر ہے۔ یہ مفکر بھی تعصب کا شکار رہا اور ان مستشرقین کی مذمت کی جنہوں نے حضور کے بارے میں نرم رویہ اختیار کیا۔ اس نے بھی حضورؐ کو نبی کاذب اور اسلام کو وحشی اور

فاسد مذہب سے تعبیر کیا۔[55]

انیسویں صدی میں 1800ء سے 1840ء تک اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر متعدد کتب شائع ہوئیں۔ ان میں سب سے اہم اور قابل ذکر تالیف ڈیوڈ پرائس کی تالیف Chronological Retrospect of Muhammdan تھی جو 1811ء سے 1821ء تک شائع ہوئی۔ مؤلف نے آنحضورؐ کے عہد سے لے کر مغل شہنشاہ اکبر تک کے تاریخی وقائع درج کیے ہیں۔ دوسری اہم تالیف ایڈورڈ افام (Edward Upham) کی History of Ottomon Empire ہے جو 1829ء میں شائع ہوئی۔ اس میں بھی مصنف نے حسب معمول حضورؐ کو نبی کاذب کہا۔ گوئٹے (1749-1832) نے آنحضورؐ پر 1773ء میں ایک نظم ترانہ محمدی Mahomet is Gesang لکھی، جس میں آنحضورؐ کو ایک چشمے سے تعبیر کیا اور حضورؐ کو وحدت الوجود کا مدرس بتاتے ہوئے احترام کے چند کلمات استعمال کیے، لیکن یہ بھی حضورؐ کے خلاف نفرت و تعصب سے پوری طرح باہر نہ آسکا اور کہا کہ محمدؐ ابتدا میں مخلص تھے مگر بعد میں بوالہوسی کا شکار ہوگئے۔ انیسویں صدی کے نصف اول تک فضا مسموم رہی مگر نصف آخر میں اسلام اور محمدؐ کی جانب ایک بار پھر رواداری اور انصاف کے مطالبے شروع ہوئے۔ اس تحریک کے قائدین میں کارلائل کا نام قابل ذکر ہے۔ اس تبدیلی کا سہرا یورپ کی روحانی تحریک کے سر ہے، جس نے فرسودہ نظام حیات، کلاسیکی عقائد اور تقشف و تعصب کو ایسا چیلنج کیا کہ پورا یورپ ہل گیا۔ کارلائل اپنے اسلامی رویہ میں مخلص نہیں تھا بلکہ اسلام اور محمد ﷺ کو اس لیے موضوع بنایا تھا کہ ارتداد کا خطرہ ٹل چکا تھا اور کوئی عیسائی اسلام قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس صدی میں جب رینکے نے تاریخی تنقیدی تحریک چلائی تو عربی مصادر کے مطالعہ پر زور دیا گیا۔ مستشرقین نے مسلم شرق اوسط اور برصغیر پاک و ہند کے دورے شروع کیے اور کتب خانوں کی تاریکیوں میں پڑے محتاج توجہ مخطوطات و مسودات کو روشنی میں لایا گیا۔ ان کتابوں اور مخطوطات و مسودات کی اشاعت سے متعلق مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں، وہ ایک ایک کر کے بہ استثنائے چند اٹھارویں صدی کے اواخر سے انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں۔ اور ان میں سے اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہو گیا۔[56] مولانا شبلی نے آگے چل کر ان عربی کتابوں کی تفصیل بیان کی ہے جو یورپ سے شائع ہوئیں۔ یوں مستشرقین یورپ کی رسائی اصل عربی مصادر تک ہو گئی اور اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر نئی کتابوں کا ظہور ہونے لگا، جن میں اسلام کو عیسائی الاصل یا یہودی الاصل ثابت کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ 1833ء میں ابراہام گیگر (Abraham Geiger) نے ایک مقالہ

زیر عنوانWhat did Muhammed take from Judaism ،پیش کیا تاکہ محمدؐ کے یہودی اور عیسائی ماخذ کو حتمی طور پر ثابت کیا جائے۔ چنانچہ اب اسلام کی اصلیت مستشرقین کا محبوب موضوع قرار پا گیا۔ ولیم میور، سپرنگر اور نولدیکے جیسے مستشرقین اس تحریک کے سرخیل بن گئے۔ ڈاکٹر سپرنگر نے حضورؐ کا طبی معائنہ کرنا ضروری سمجھا اور اپنی رپورٹ میں حضورؐ کو اعصابی مریض یا مصروعEpileptic ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ولیم میور کی(Life of Mahomet) قرون وسطیٰ کے خرافات کا مجموعہ ہے۔ اس نے حضورؐ اور قرآن کریم کو تہذیب، آزادی اور حق کا بد ترین دشمن قرار دیا۔ نولدیکے، سپرنگر اور ولیم میور سے بھی دریدہ دہن ثابت ہوا۔ اس نے اپنی تاریخ قرآن میں جو 1875ء میں برلن سے طبع ہوئی، حضور کو ہذیان اور جذباتی دوروں کا مریض قرار دیا، جن کی وجہ سے آپؐ کو یقین ہو گیا تھا کہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی ہے۔[57]

بیسویں صدی میں جونہی یورپ کی فضا بدلی تو تحریک استشراق نے بھی رنگ بدلا۔ اب ایسے مصنفین منظر عام پر آنے لگے جنہوں نے اپنے پیروؤں کی تحریروں پر شدید تنقید کی۔ انہوں نے اسلام کے بارے میں کچھ ایسی کتابیں لکھنا شروع کیں جن میں اسلام کے کچھ شعبوں کی تعریف کی گئی تھی، لیکن نسلی اور دینی تعصب نے ان کو بھی انصاف کے آئینے میں حقائق کو دیکھنے کی مہلت نہ دی۔ دراصل ان نئے مصنفین کا مقصد حق کی جستجو تھا ہی نہیں، بلکہ ان کا مقصد تو صرف مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنا تھا اور اپنے رویے میں معمولی سی تبدیلی سے انہوں نے یہ مقصد حاصل کر لیا۔ انہوں نے اسلام سے متعلق چند کلمات خیر کہے تو مسلمان مصنفین نے ان کی تعریف میں بڑھ چڑھ کر اپنا زور قلم صرف کیا۔ انہیں منصف مزاج عالم اور غیر جانبدار محقق کے خطابات دیے۔ حالانکہ ان لوگوں نے بھی اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر حملے کرنے میں کوئی دقیقہ فراگزاشت نہیں کیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر کا ایک بہت بڑا مستشرق سر ہملٹن گب کو سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نام مسلمان اور مستشرقین بڑے احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ اس کی کتاب محمڈنزم(1962) خود بد مذاقی کا عظیم ثبوت ہے۔ ایک دوسری تالیف Modern Trends in Islam میں اس نے اسلام کے بارے میں نہایت دلسوز باتیں تحریر کی ہیں۔ اس کتاب کے چھٹے باب میں گب نے لکھا ہے کہ اسلام دراصل محمدؐ کا ہیجانی دین تھا۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جدید معقول دینیات Rational Theologyاب محمد کے ہیجانی دین پر غالب آگئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ عالم اسلام میں مسلم حکمرانوں اور روشن خیال مغربی تعلیم یافتہ حضرات کے ہاتھوں اسلام کشی کی جو تحریک شروع ہوئی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محمدؐ کا جذباتی مذہب اب عقلیت سے تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند

کی اسلامی تحریکات اور تحریک تجدد سے بحث کرتے ہوئے مؤلف علیگڑھ اور سرسید کی تعریف کرتا اور قادیانی تحریک کی زور دار حمایت کرتا ہے، جبکہ اقبال کو مجموعہ تضاد قرار دے کر اس کے خیالات کی دھجیاں اڑاتا ہے۔ منٹگمری واٹ کی رواداری کا خاصا چرچا ہے مگر اس کی کتابوں محمد ایٹ مکہ اور محمد ایٹ مدینہ اور Muhammad: Prophet and Statesman کا بغور مطالعہ کیا جائے تو تعصب صاف نظر آئے گا۔ وہ یہ تصور دینے کی کوشش کرتا ہے کہ حضورؐ مکہ میں کچھ اور تھے اور مدینہ میں کچھ اور ہو گئے۔ ان تمام حقائق سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مستشرقین شروع سے تاایں دم اسلام کے خلاف نفرت و عناد سے لبریز چلے آرہے ہیں۔

استشراق اور عصر حاضر:

جب نو آبادیاتی نظام کے شکنجے کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ مختلف ممالک میں آزادی کی تحریکیں اٹھنا شروع ہوئیں اور اہل مغرب نے محسوس کیا کہ اگر مسلمان جاگ اٹھے تو مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے۔ نیز اپنی تہذیب اور طرز حیات پر فخر کرنے لگیں گے۔ یوں ساری دنیا کو عیسائی بنانے کا خواب بھی چکنا چور ہو جائے گا اور اہل مغرب کی تخیلاتی نسلی برتری کا محل بھی زمین بوس ہو جائے گا۔ چنانچہ اہل مغرب نے مستشرقین کی مدد سے نیا لائحہ عمل مرتب کیا۔ اب مستشرقین نے اسلام کے روایتی مطالعے پر توجہ کم کردی اور دور حاضر کے مسلمان معاشروں میں پائے جانے والے رجحانات کا تفصیلی مطالعہ شروع کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ میں جو سکاربرو (Scarbrough Report) پیش کی گئی، اس میں برطانوی مفادات کے تحفظ کے لیے نیا لائحہ عمل پیش کیا گیا۔ مشہور مستشرق ایچ اے آر گب (H. A. R. Gibb) نے اپنی کتاب Modern Trends in Islam میں نئے تقاضوں کے پیش نظر مسلمانوں کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔[58] مستشرقین اپنی حکومتوں کے دست راست اور اپنے اپنے ملک کی وزارت خارجہ کے مشیر بنے اور اپنے وسیع تجربے اور مطالعے سے فائدہ اٹھا کر ایسی پالیسیاں وضع کیں کہ استعماری طاقتوں کے چلے جانے کے بعد بھی مسلمان ان کی ضرورت محسوس کریں۔ اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے۔ چنانچہ استعماری طاقتوں نے دم واپسیں مستشرقین کے مشورے سے مسلمانوں پر جو وار کیے تھے، ان کے اثرات آج تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ نصاب تعلیم ہی کو دیکھیں، ہم آج تک اپنے مدارس میں وہی نصاب پڑھا رہے ہیں جو مستشرقین ہمیں عطا کر گئے ہیں۔ اس نظام تعلیم نے دین کو دنیا اور علوم جدیدہ کو مسلمانوں کے روایتی علوم سے علیحدہ کر دیا ہے۔ ملت تقسیم ہو گئی ہے اور علم کے میدان میں اقوام مغرب سے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ آج

مسلمان عربی اور اسلامیات تک سیکھنے کے لیے یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں داخلے لیتے ہیں اور ان مسخ شدہ اسلامی مصادر کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو مستشرقین نے اپنے مخصوص مقاصد کے لیے تیار کیے ہیں۔ چنانچہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ استعماری طاقتوں کے چلے جانے کے بعد بھی مسلمان نظراً اور عملاً ان کے غلام ہیں۔ مسلمان ممالک کی داخلی اور خارجی پالیسیاں سب انہیں کے اشارے پر بنتی ہیں۔

عصر حاضر میں مستشرقین کو ایک اور چیلنج در پیش ہوا۔ مسلم ممالک کا حکمران طبقہ اور ارباب بسط و کشاد تو بلا شبہ یورپ کے اندھے مقلد اور اس کے نخچیرزبوں چلے آتے ہیں۔ تاہم ان ممالک کے اندر سے ایسی تحریکیں اٹھنا شروع ہوئیں،جو نفاذ اسلام کا مطالبہ کرنے لگیں۔ برصغیر،مصر اور افریقہ کے مسلم ممالک میں ایسی تحریکوں نے زور پکڑا۔اس صورت حال نے ایک بار پھر اہل مغرب کا سکون برباد کر دیا، کیونکہ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ان کی استشراقی اور الحادی کوششوں سے مسلمانوں کا رابطہ ان کے مرکز قوت سے کٹ چکا ہے، جس کے بحال ہونے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ چنانچہ مستشرقین ایک بار پھر استشراقی، تبشیری اور استعماری آرزوں کے محل کی حفاظت کے لے میدان میں آگئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لیے بنیاد پرست اور دہشت گرد وغیرہ کی اصطلاحیں وضع کیں اور میڈیا کے ذریعے ان اصطلاحوں کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا کہ خود مسلمان زعماء بھی ان کے دام فریب میں آگئے۔ مختلف ممالک میں اسلام کے حق میں اٹھنے والی آوازوں کو کچلا گیا۔ اسلام پسندوں کواقتدار سے محروم رکھنے کی سازشیں ہونے لگیں۔ مسلمانوں کی طرف سے ایٹم بم بنانے کی کوششوں کو اسلامی بم کا نام دیا گیا اور ابھی افغانستان کو اسلام کا نام لینے کی پاداش میں جس طرح تہس نہس کیا گیا اور عراق اقتصادی اور سیاسی مفادات کے زیر اثر یورپ اور امریکہ کے ہاتھوں جس طرح زیر و زبر ہوا، اس کا حال سب کے سامنے ہے۔ لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ با ایں ہمہ مسلمان دہشت گرد ہیں اور امریکہ اور یورپ امن پسند۔

تحریک استشراق کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مستشرقین نے اس کا آغاز دو جہتوں میں کیا تھا،ایک طرف تو انہوں نے مسلمانوں کے علمی ذخائر کو اپنے ممالک میں منتقل کرنے اور انہیں استعمال میں لا کر مادی اور تہذیبی میدانوں میں ترقی کرنے کی کوششیں شروع کیں اور دوسری طرف مسلمانوں کے دین، ان کی تاریخ و تہذیب کو مسخ کرنے، مسلمانوں کو اپنے دین سے بیگانہ کرنے اور غیر مسلم لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے کی بھرپور مہم چلائی۔ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ان کے طریقہ ہائے کار میں تو تبدیلیاں آتی رہیں لیکن جس مقصد کے تحت اس تحریک کا آغاز ہوا تھا، وہ مقصد

مستشرقین کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوا۔ مستشرقین نے کبھی طالب علموں کا روپ اختیار کیا کبھی جسموں پر صلیبیں سجائیں، کبھی تحقیق و جستجو کے نام پر ممالک اسلامیہ کے کونے کونے میں پہنچے، کبھی مسلمانوں کے ہمدرد اور خیر خواہ بن کر منظر عام پر آئے اور کبھی پسماندہ اقوام کے لیے مشفق و مربی کا روپ دھارا۔ لیکن اتنے روپ بدلنے کے باوجود ان کا مقصد ہمیشہ ایک ہی رہا اور وہ مقصد اسلام کی بیخ کنی کے سوا کچھ نہ تھا۔

اہداف و مقاصد اور طریق کار:

مستشرقین اپنی کتابوں میں اسلام کی نہایت بھونڈی تصویر اور پیغمبر اسلام ﷺ کو ایک افسانوی کردار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ قرآن حکیم کو نعوذ باللہ ایک لغو کتاب سمجھتے اور ہر قابل تصور برائی اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ بات کتنی عجیب ہے کہ جن موضوعات کی طرف کسی خیر کو نسبت دینا وہ مغرب کی توہین سمجھتے ہیں ان موضوعات پر انہوں نے کتابوں کے ڈھیر لگادیے ہیں، جن سے یورپ اور امریکہ کی لائبریریاں بھری پڑی ہیں۔ اگر اسلام اور پیغمبر اسلام کا تصور اتنا ہی گھناؤنا ہے، جتنا وہ بنا کر پیش کرتے ہیں تو انہوں نے ان پر لکھنے اور تحقیق و تدقیق میں اتنا وقت اور سرمایہ کیوں صرف کیا۔ بلاشبہ مستشرقین کے ذریعے مسلمانوں کا سرمایۂ علم محفوظ ہوا، جس پر مسلمان ان کا احسان بھی مانتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کے علمی ورثے کو لوٹا اور اپنے اسلام مخالف عزائم کی غرض سے اس سے اعتنا کیا۔ اقبال یورپ کے کتب خانوں میں اپنے علمی ورثے کو دیکھ کر اسی لیے تڑپ اٹھے تھے کہ:

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی نہیں دنیا کی آئین مسلم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ہم یہاں یہ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ اہل مغرب کی مشرق اور اسلام پر اتنی توجہ کے پیچھے کیا مقاصد کارفرما ہیں؟ اور ان کے حصول کے لیے وہ کیا طریقے اختیار کرتے ہیں؟ تحریک استشراق میں چونکہ مختلف ممالک سے وابستہ لوگ شامل ہیں نیز ان کے کئی طبقات ہیں اور مفادات بھی مختلف ہیں، لہٰذا ہر طبقے کا کام دوسرے سے مختلف ہے، اس لیے جن مقاصد کے تحت یہ مشرقی تہذیبوں خصوصاً اسلام پر توجہ دیتے ہیں، وہ مقاصد بھی متعدد اور مختلف ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ہم مستشرقین کے مقاصد کو حسب ذیل چند عنوانات کے تحت بیان کرسکتے ہیں۔

مذہبی مقاصد:

تحریک استشراق کی تاریخ کے طالب علم کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ اس کا آغاز جس مقصد کے تحت ہوا وہ مذہبی تھا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں اسلام جس سرعت کے ساتھ پھیلا اور اس نے جس طرح لا تعداد انسانوں کے قلوب و اذہان کو مسخر کیا۔ یہ سب کچھ اہل صلیب کے لیے زبردست تشویش کا باعث ہوا۔ ان کے سامنے ان کی بقاء کا مسئلہ تھا۔ وہ دین اسلام کو کسی طور بھی پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ وہ علوم اسلامیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سلسلہ میں اپنے مذہب کے حوالے سے تین مقاصد ان کے پیش نظر تھے۔ دین اسلام کو دنیا کی اقوام میں عموماً اور یہودی و عیسائی اقوام میں خصوصاً پھیلنے سے روکا جائے، مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے تگ و دو کی جائے اور عیسوی عقائد معلوم کرنے کے لیے کتاب مقدس کے یورپی زبانوں میں ترجموں پر اعتماد کی بجائے، عبرانی زبان کے نسخوں پر اعتماد کیا جائے۔ اس کام میں یوحنا کلیفن اور لوتھر وغیرہ پیش پیش تھے۔ لوتھر نے جب کلیسا کے خلاف آواز اٹھائی تو اس کے دعوت کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ تورات کو اس کی اصلی عبرانی زبان میں پڑھا جائے۔[59] لیکن چونکہ عبرانی زبان ایک زندہ زبان کے طور پر کہیں رائج نہ تھی اور عربی اور عبرانی زبانیں ایک دوسرے کے بہت قریب تھیں، لہذا عبرانی جاننے کے لیے عربی سیکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ یورپ اور دنیائے عیسائیت کے طول و عرض میں ایسے اداروں کا جال بچھ گیا جن میں عربی زبان کی تدریس کا بندوبست تھا۔ کتاب مقدس کی اصلاح اور بائبل کے بیانات کی تفسیر کے سلسلہ میں ممالک اسلامیہ کے حالات کا معروضی جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو اس مقصد کے لیے ممالک اسلامیہ میں باقاعدہ مہمیں بھیجی گئیں۔ ان مہمات کا مقصد مشرقی علاقوں میں ان آثار قدیمہ کو تلاش کرنا تھا جن کا ذکر بائبل میں ہے۔ لیکن ان مہموں اور آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے جو نتائج ظاہر ہوئے وہ انتہائی حیران کن ہیں۔ Times دسمبر 1995ء کی اشاعت میں Michael-D- Lemonick کا مضمون بعنوان Are the Bible Stories True شائع ہوا۔ اس مضمون میں ابراہیمؑ اور دیگر بزرگان اسرائیل کو بائبل کے مصنفین کی اختراع قرار دیا گیا ہے اور موسیٰؑ کو ایک تمثیلی ہیرو بتایا گیا ہے، جسے عبرانیوں نے اپنی قومی تشخص اور یکجہتی کو لوگوں کے ذہن نشین کرانے کے لیے تخلیق کیا تھا۔ نیز یہ تحقیق بھی سامنے لائی گئی ہے کہ واقعہ خروج (جو بائبل کا اہم واقعہ ہے) کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔[60] ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جن لوگوں کا اعتماد آثار قدیمہ کی تحقیقات پر ہے وہ ان حقائق کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں جن پر تمام الہامی مذاہب صدیوں سے متفق چلے آرہے ہیں۔ لیکن جو لوگ بائبل کے کسی بیان

پر تنقیدی نظر ڈالنے کے روادار نہیں ان کو مذکورہ تحقیق کی مدد سے مشرق کے چپے چپے پر ایسے آثار نظر آتے ہیں، جن سے بائبل کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔ڈاکٹر محمد عبدالمتعال الجبری نے علامہ اسد کے حوالے سے لکھا ہے کہ سولھویں صدی سے جتنے لوگ مغرب سے مشرق آتے ہیں انہیں یہاں تو رات کے حادثات و واقعات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اہرام مصر کو وہ گندم کے گودام سمجھتے ہیں، جنہیں یوسف بن اسرائیل نے تعمیر کیا تھا۔ "ھلیو بولس" کی شکل میں انہیں وہ خفیہ مستقر نظر آتا ہے، جہاں مقدس خاندان آرام فرما ہوا تھا۔ سمندر کے کنارے بکھری ہوئی ہڈیاں انہیں فرعون اور اس کے لشکریوں کی ہڈیاں معلوم ہوتی ہیں، جو اسرائیلیوں سے مقابلے کے وقت یہاں ہلاک ہوئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اسرائیلیوں کو اپنے آباو اجداد کی نشانیاں مصروعرب سے آگے بھی نظر آتی ہیں۔1472ء میں وینس کی ایک مہم کو ساسانی بادشاہ "شاپور اول" کی شکل میں تورات کا "شمشون" نظر آگیا۔[61] دراصل اسرائیلیوں کو مشرق میں ہر طرف اپنے آبا واجداد کے آثار اس لیے نظر آتے ہیں کہ یہودی نہ صرف نیل سے فرات تک کے علاقے کو اپنے اجداد کی میراث سمجھتے ہیں بلکہ ساری دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ جن علاقوں پر ان کی خصوصی نظریں ہیں ان پر اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے یہودیوں کو اس قسم کے آثار کی ضرورت ہے۔

یہود ونصاریٰ نے کتاب مقدس کی اصلاح و تفسیر کے لیے جو کوششیں کیں ان سے دینی مقاصد تو پورے نہ ہوئے، بلکہ ان کی اکثریت کا اعتماد الہامی کتابوں سے اٹھ گیا،البتہ ان تحقیقات سے انہیں سیاسی اور اقتصادی فوائد ضرور حاصل ہوئے۔اہل مغرب نے ان علاقوں میں اپنی نو آبادیاں قائم کرنے اور ان کے وسائل کو مغرب میں منتقل کرنے کے لیے ان تحقیقات سے بہت استفادہ کیا۔اسلام سے مبارزت کے لیے ایسے افراد تیار کرنے شروع کیے گئے جو مسلمانوں کے عقائد اور مذہبی اعمال کو اس انداز میں پیش کرنے کی مہارت رکھتے ہوں جو مستشرقین کے موقف کے مطابق ہو۔ ان تربیت یافتہ لوگوں کو اسلامی ممالک میں تبلیغی مشنوں پر بھیجا جانے لگا۔ مغربی سیاستدانوں سے گٹھ جوڑ کیا گیا اور تبلیغی کاموں کی خاطر سرمائے کی فراہمی کے لیے حکومتوں کے علاوہ بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں کے ساتھ بھی روابط قائم کیے گئے۔اپنے کام کو منظم کرنے، اس کی رفتار تیز کرنے اور تبلیغی کاوشوں کا رخ متعین کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً کانفرنسیں منعقد کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔[62] ان کانفرنسوں میں یہ لوگ جس قسم کے پروگرام بناتے تھے اس کا اندازہ کرنے کیلیے 1906ء میں قاہرہ میں منعقد ہونے والی تبشیری کانفرنس کے ایجنڈا کی اہم شقیں ملاحظہ ہوں: دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کا جائزہ۔ افریقہ، سلطنت عثمانیہ، ہندوستان، فارس، ملایا

اور چین میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کا تفصیلی سروے۔ایسی کتابوں کی تیاری اور اشاعت جن کو تعلیم یافتہ مسلمانوں اور مسلم عوام کے درمیان پھیلانا ضروری ہے۔لوگوں کو عیسائی بنانے کی کوششیں۔ مرتد ہو جانے والوں کا جائزہ۔ عیسائیت قبول کرنے والے غربا کی مدد۔ مسلم عورتوں کے معاملات۔ مبشرین کی تربیت اور باہمی رابطہ۔مسلمانوں کے لیے نظام تعلیم۔[63]

اس تبشیری کانفرنس کے ایجنڈے سے پتہ چلتا ہے کہ مبشرین کو اسلام اور مسلمانوں کی کتنی فکر تھی اور ان کے متعلق ان کی سوچ اور کام کا انداز کیا تھا۔اس میں اہل اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کے لوگوں میں عیسائیت کی تبلیغ کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ جس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کا ہدف خاص طور پر اسلام اور مسلمان ہی تھے۔ڈاکٹر عبدالمتعال الجبری نے لکھا ہے کہ سینی گال کے فرانسیسی مستعمرین لوگوں کو وسائل حیات سے محروم کرتے تھے پھر غریب سینی گالیوں کو غذائی اشیاء مثلا چاول، گھی اور آٹے کی شکل میں امداد پیش کرتے تھے۔ مگر امداد کی شرط یہ تھی کہ ہر صاحب حاجت خاندان اپنے ایک پندرہ سالہ بچے کو کلیسا کے حوالے کرے تاکہ کلیسا اسے اپنے مدارس میں تعلیم دے۔ساتھ یہ بھی وعدہ لیا جاتا تھا کہ اگر کسی خاندان نے بچے کی تعلیم سے قبل اس کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اس نے جتنی امداد حاصل کی ہوگی سب لوٹانا پڑے گی۔[64]

سیاسی مقاصد:

ایڈورڈ ڈبلیو سعید نے تحریک استشراق کے اہتمام و انضباط کو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اہل مغرب کی سیاسی مقاصد کے حصول کی کوششوں کا شاخسانہ قرار دیا ہے۔[65] اہل مغرب نے مسلمانوں کے ممالک پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھا تو انہوں نے صدیوں کے تلخ تجربات کی بنا پر تلوار کے استعمال کو خلاف مصلحت سمجھا۔انہوں نے انسانوں کی ایسی جماعتیں تیار کیں جنہوں نے علم و محبت اور خدمت انسانیت کے حسین جامے زیب تن کر رکھے تھے۔ان کا کام یہ تھا کہ جب عملی طور پر اہل مغرب ان ممالک پر اپنا سیاسی تسلط قائم کرنے کے لیے آگے بڑھیں تو ان ممالک کے شہریوں کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کاامکان نہ ہو۔یورپی طاقتوں ہالینڈ، فرانس اور انگلستان نے مستشرقین اور مبشرین کی بھرپور حوصلہ افزائی کی اوران پر پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ مستشرقین اور مبشرین میں سے اکثر لوگ مغربی طاقتوں کے تنخواہ دار ملازم تھے۔ان ملازمین نے دولت کے بل بوتے پر تعلیمی اداروں، ہسپتالوں، فلاحی اداروں، غریبوں اور محتاجوں کے لیے امدادی منصوبوں، اخبارات و رسائل، کتابوں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کی بھرپور کوششیں کیں۔مولانا ابو الحسن علی ندوی کے مطابق

مستشرقین عام طور پر مغربی حکومتوں اور اقتدار کا ہر اول دستہ رہے ہیں۔وہ مغربی حکومتوں کو علمی کمک پہنچاتے ہیں۔وہ مشرقی اقوام و ممالک کے رسم و رواج، طبیعت و مزاج، طریق ماند و بود اور زبان و ادب بلکہ جذبات و نفسیات کے متعلق صحیح اور تفصیلی معلومات فراہم کرتے ہیں تاکہ ان پر مغرب کو حکومت کرنا آسان ہو۔اس کے ساتھ ساتھ وہ ان حالات و تحریکات اور عقائد و خیالات کا "توڑ" کرتے رہتے ہیں جو ان حکومتوں کے لیے پریشانی اوردرد سر کا باعث ہیں، اور ایسی ذہنی اور علمی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں،جس میں ان حکومتوں کی مخالفت کا خیال ہی پیدا نہ ہونے پائے۔اس کے بالمقابل ان کی تہذیب کی عظمت اور ان کی خدمات کی ایسی وقعت پیدا ہو اور اپنے ملک کی اصلاح و ترقی اور ان کو مغرب کے نقش قدم پر لے چلنے کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ ان مغربی حکومتوں کے ہٹ جانے پر بھی ان کا دینی اور تہذیبی اقتدار قائم رہے۔اسی بنا پر مغربی حکومتوں نے مستشرقین کی اہمیت و افادیت کو پوری طرح محسوس کیا اور ان کے سربراہوں نے ان کی پوری سر پرستی کی اور اس مقصد کے تحت مختلف ممالک کے مستشرقین عالم اسلام سے متعلق رسائل اور مجلات شائع کرتے رہے ہیں،جن میں عالم اسلام کے مسائل اور رجحانات پر مبصرانہ تبصرے اور ماہرانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔[66]

مستشرقین کے سیاسی مقاصد میں سے ایک مقصد "مسلم مسیحی اتحاد" قائم کرنا بھی ہے۔اس دور میں اس مقصد کے حصول کے لیے بڑی منظم کوششیں جاری ہیں۔عیسائیوں نے بڑی ہوشیاری سے نہایت ذہین افراد کو اس کام پر لگایا ہے،جو مشرقی یونیورسٹیوں میں لیکچرز کی شکل میں مذکورہ مقصد کے لیے مسلمان نوجوانوں کو ذہنی طور پر تیار کرتے ہیں۔یورپی اور امریکی حکومتیں اپنے سیاسی مقاصد میں معاونت کے لیے مسلم علما اور سکالرز کو بھاری معاوضے ادا کرتی ہیں۔اس سلسلہ میں روزنامہ جنگ لاہور کی 6جنوری 2006کی اشاعت میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ قابل ملاحظہ ہے۔رپورٹ میں امریکی اخبار کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ مسلمان علماء و دانشوروں اور ممتاز شخصیات کو امریکی موقف اور پالیسیوں کی حمایت کے لیے معقول معاوضے ادا کرنے کا امریکی پروگرام نہایت خاموشی سے جاری ہے، اور اس سلسلے میں 2005ء کے اوائل میں امریکی محکمہ دفاع نے اپنے کنٹریکٹر لنکن گروپ نامی پبلک ریلیشن کمپنی سے کہا تھاکہ وہ عراق کے سنی علماء اور شخصیات میں سے ایسے علماء کی نشاندہی کرے جو عراق کے صوبہ الانبار سے تخریب کاری ختم کرانے اور عراقی انتخابات میں حصہ لینے کی حمایت میں رائے عامہ ہموار کرنے میں مدد دے سکیں۔گروپ کے ایک وفد نے 2005کے اوائل میں پاکستان کے ایک وفاقی وزیر سے بھی ملاقات کی تھی۔امریکی اخبار نے انکشاف کیاہے کہ اب بھی چار عراقی سنی علماء اور دانشور امریکی

فوج کے لیے تجاویز، مشورے اور حقائق پر مبنی رپورٹیں تیار کرنے کا کام کر رہے ہیں، جبکہ لنکن گروپ کے ایک اعلیٰ عہدیدار پیج کریگ کا کہنا ہے کہ ان کی کمپنی مذہبی شخصیات، سرکاری حکام اور مقامی تاجروں سے بھی ملاقاتیں کر کے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کرتی ہے۔تاہم انہوں نے مزید تفصیلات بتانے سے گریز کیا ہے۔ کمپنی کے ریکاڈسے پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ مئی اور ستمبر کے دوران عراق کے صوبہ الانبار میں انفارمیشن آپریشن پر کئی لاکھ ڈالر خرچ کیے گئے۔[67] ڈاکٹر محمد امین کے مطابق امریکی وزارت خارجہ کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے مالی ذرائع اور افرادی وسائل کو استعمال کرتے ہوئے اس بات کے انتظامات کیے جائیں کہ مسلمانوں میں بنیاد پرست طبقے مقبولیت حاصل نہ کر سکیں۔ مسلم معاشروں کو جدت پسندی کے نام پر مغربی رنگ میں رنگ دیا جائے اور وہاں صرف وہی اسلام باقی رہ جائے جو امریکی و مغربی افکار و تصورات سے ہم آہنگ ہو۔اس مقصد کے لیے رشوت کی گرم بازاری بھی ہے، ترغیبات کی فتنہ سامانی بھی اور آلات حرب و ضرب کی دہشت ناکی بھی۔[68] مستشرقین کی اکثریت چونکہ وزارت خارجہ کے محکموں سے وابستہ ہے اس لیے سیاسی طور پر انہیں اپنے منصوبے روبہ عمل لانے کے لیے خاطر خواہ سہولتیں میسر ہیں۔باخبر لوگ ان کی ان سرگرمیوں سے بخوبی واقف ہیں،جو یہ لوگ عرب ممالک میں شبانہ روز جاری رکھے ہوئے ہیں۔[69] ڈاکٹر مصطفی سباعی مرحوم نے عرب ممالک میں استشراقی حوالے سے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے اہل مغرب کی سفارتی کاروائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عرب کے تمام ممالک کے سفارتی مراکز میں سیاسی پالیسی کے نام پر کسی خاص سیکرٹری یا کلچر اتاشی کا تقرر کر دیا جاتا اور تقرر کے ساتھ یہ شرط لگا دی جاتی کہ وہ عربی زبان کا ماہر ہو تاکہ اپنی علمی سند کی بنا پر اس ملک کے اہل قلم، صاحب فکر اور سیاسی عناصر سے اپنا رابطہ قائم کر کے اپنی سفارتی پالیسی کے تحت ان میں شورش و کشمکش کی تازہ روح اور نئی غذا فراہم کرتا رہے۔ ہماری آنکھیں اس کے سنگین نتائج دیکھ چکی ہیں۔بہت سے عربی ممالک میں یہ کھیل کھیلا گیا، جو ان میں آپس کی تفریق اور ملکی انتشار کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ان سفراء نے،جن میں سے بہت سے اب بھی اپنی جگہوں پر فائز ہیں، عربی اور اسلامی اصطلاح میں فرق کر کے ان کے ملکی دوستانہ تعلقات کو ٹھیس پہنچائی ۔انہوں نے خیر سگالی کے معصوم جذبے کے تحت عرب ممالک کی طاقت کو منتشر کیا، لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب انہوں نے اپنے ملک کے کرتا دھرتا لوگوں کو اپنا فلسفہ اچھی طرح سمجھا دیا اور ان پر ان کی عوامی سیاسی کمزوریوں کو واضح کر دیا، اور جب اس ملک کے رہنے والوں نے فرقہ وارانہ رخوں کو سامراجی مصالح کی آڑ سے دیکھ لیا تھا۔یہ لوگ عرب ممالک میں اس پرانی قومیت کو،جسے گردش زمانہ

نے صدیوں نظروں سے اوجھل کر دیا تھا،اہمیت دے کر زندہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔اسلام سے پہلے عرب کی ''قومی کہانیوں'' کو یاد دلاتے ہیں۔ان کی زبان، عقیدہ اور ملک کی ایکتا کو ابھارتے ہیں۔ نصف صدی گزر گئی مگر یہ لوگ مسلسل مصر میں فرعونیت، شام میں فنیقیت اور عراق میں اشوریت کو دوبارہ زندگی دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ''اخوت و ایکتا'' کے نام پر گروہی طبقے جاگ اٹھیں۔ آزادی کی قوت سلب ہو اورہماری ہی زمین پر ہماری قوت، آزادی اور سیاست دم توڑ دے اور عقیدہ و تاریخ میں انتشار پیدا ہو۔[70]

اقتصادی مقاصد:

اہل مغرب خصوصاً اٹلی کے لوگوں کے مشرقی ممالک کے ساتھ قدیم تجارتی تعلقات تھے۔اہل مشرق کے ساتھ اپنے تجارتی تعلقات کو اچھے طریقے سے طے کرنے کے لیے انہوں نے عربی زبان کی تحصیل پر خصوصی توجہ دی۔ یہاں تک کہ 1265ء میں تونس اوراٹلی کے شہر ''بیزا''کے تاجروں کے مابین جو تجارتی معاہدہ ہوا، اسے عربی زبان میں لکھا گیا۔ وینس کو مشرق و مغرب کے درمیان ہمزہ وصل کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں کے لوگ عربی زبان بھی بولتے تھے۔ 1435ء میں سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کیا تو عربی کے ساتھ ساتھ ترکی کو بھی رائج کرلیا۔اہل مشرق کے ساتھ اٹلی کی تجارت کو دیکھ کر فرانس بھی اس طرف متوجہ ہوا۔فرانسیسیوں نے 1665ء میں ''شارنیتیہ'' کی قیادت میں مشرقی مماک کے سروے کے لیے ایک مہم ترتیب دی۔اس مہم کے ارکان کی اکثریت مختلف شعبوں کے علماء و ماہرین پر مشتمل تھی۔ان لوگوں نے فرانسیسیوں کے لیے ممالک شرقیہ کے خزانوں کا سراغ لگایا اور مختلف طریقوں سے انہیں حاصل کرنے کی کوشش کی۔[71] بعد میں اس قسم کی کوششوں میں انگلینڈ بھی شامل ہو گیا۔ انگلینڈ کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے برصغیر میں جو کردار ادا کیا تھا،وہی کردار دیگر ممالک اسلامیہ میں کئی مغربی کمپنیوں نے انجام دیا۔ جرمنی اور امریکہ بھی اس میدان میں کود گئے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔انہوں نے ممالک اسلامیہ میں پھیلے ہوئے خام مال کے ذخیروں اور دوسری دولت کو مغرب میں منتقل کرنے کے لیے ریلوے لائنیں بچھائیں۔ نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو وہ اپنے ساتھ علماء کا ایک لشکر بھی لایا تھا،تاکہ وہ ممالک شرقیہ کی دولت کا کھوج لگائیں اور اس کو اہل مغرب کے لیے حاصل کرنے کی تدبیریں سوچیں۔ واسکو ڈے گاما کے ہندوستان کے سفر کے بعد پرتگال کی تجارتی کمپنیاں مشرقی ممالک میں سرگرم عمل ہو گئیں۔[72] ڈاکٹر عبدالمتعال الجبری نے مشرق کے متعلق مغربی لوگوں کے لوٹ کھسوٹ اور ظلم و ستم کے رویہ کے

بارے میں ایک انگریز ادیب "سدنی لو" کا تبصرہ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مغرب کی عیسائی حکومتیں کئی سالوں سے امم شرقیہ کے ساتھ جو سلوک کر رہی ہیں،اس کی بنا پر یہ چوروں کے اس گروہ سے کتنی مشابہت رکھتی ہیں،جو پر سکون آبادیوں میں داخل ہوتے، ان کے مزدور مکینوں کو قتل کرتے اور ان کا مال اسباب لوٹ کر لے جاتے ہیں۔کیا وجہ ہے کہ یہ حکومتیں ان قوموں کے حقوق پامال کر رہی ہیں جو آگے بڑھنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔کتوں جیسے اس لالچ کا جواز کیا ہے کہ ان قوموں کے پاس جو کچھ ہے ان سے چھیننے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔یہ عیسائی قومیں اہل مشرق کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہر قسم کی خوبیوں سے اس طرح تہی دامن ہو گئی ہیں کہ زمانہ قدیم کے ظالم ترین لشکروں میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔[73]

بہت سے مستشرقین روزی کمانے کے لیے تحریک استشراق میں شامل ہو گئے۔بہت سے فضلاء اس کو ایک کامیاب پیشے کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔بہت سے ناشرین اس بنا پر کہ ان کی کتابوں کی جو مشرقیات اور اسلامیات پر لکھی جاتی ہیں،یورپ اور ایشیاء میں بڑی منڈی ہے، اس کام کی ہمت افزائی اور سرپرستی کرتے ہیں، اور بڑی سرعت کے ساتھ یورپ اور امریکہ میں ان موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی ہیں، جو بہت بڑی مالی منفعت اور کاوبار کی ترقی کا ذریعہ ہیں۔[74] ڈاکٹر مصطفی سباعی کے مطابق اہل مغرب نے مسلمانوں کے ساتھ تجارتی معاملات کا سلسلہ شروع کیا۔مسلمان ملکوں نے ان کی مصنوعات کو قبول کیا اور انہوں نے مسلمانوں کے قدرتی خام مال کی قیمتیں دنیا شروع کیں، جس کی وجہ سے مقامی صنعت و حرفت کے مراکز ختم ہوئے اور ان کی جگہ مغرب کے فولادی کارخانے قائم ہونے لگے۔[75]

علمی مقاصد:

تحریک استشراق کے علمی مقاصد میں یونیورسٹیوں میں علوم شرقیہ کی تعلیم، دنیا کے طول و عرض میں مدارس کا قیام، مخطوطات جمع کرنا، مختلف کتابوں کی تحقیق، کتابوں کو شائع کرنا، عربی کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے کرنا، اور مختلف موضوعات پر کتابیں تالیف کرنا شامل ہیں۔لیکن ان تمام علمی کاوشوں کے پیچھے خدمت علم کے جذبے سے کہیں زیادہ اسلام اور مسلمانوں سے مقابلہ مقصود رہا ہے۔بلا شبہ مستشرقین میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جنھوں نے صرف علم کے حصول اور خدمت علم کے جذبے سے اپنی زندگیاں تحقیق کے خار زار میں گزار دیں، انتہائی دماغ سوزی، دیدہ ریزی اور جفاکشی سے کام لیا، جس کی داد نہ دینا اخلاقی کوتاہی اور علمی ناانصافی ہے۔انہی کی کوششوں سے بہت سے مشرقی و اسلامی علمی جواہرات و نوادر پردہ خفا سے نکل کر منظر عام پر آئے اور جاہل وارثوں اور ظالم کیڑوں کی دست برد

سے محفوظ ہو گئے۔متعدد اعلیٰ اسلامی مآخذ و تاریخی و ثائق ہیں،جو ان کی محنت و ہمت سے پہلی مرتبہ شائع ہوئے، اور مشرق کے اہل علم نے ان سے اپنی آنکھوں کو روشن کیا۔اس علمی اعتراف کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ مستشرقین نے بالعموم اسلامی علوم کے وسیع مطالعہ سے حقیقی فائدہ حاصل نہیں کیا۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نتائج ہمیشہ مقاصد کے تابع ہوتے ہیں،اور مستشرقین کاکام چونکہ اپنے مخصوص مقاصد کے تحت عام طورپر کمزوریوں کو تلاش کرنا اور ان کو چمکانا ہوتا ہے، اس لیے صفائی کے ایک انسپکٹر کی طرح ان کو گلزار و جنت نشاں شہر میں صرف غیر صحت مند مقامات ہی نظر آتے ہیں۔[76]

بدلتا ہوا طریق کار اور حکمت عملی:

جدید و قدیم مستشرقین کے خیالات کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ لوگ اپنی حکمت عملی بڑے غور و فکر کے بعد مرتب کرتے ہیں اور پھر قدم قدم پر اس کا تنقیدی جائزہ لیتے رہتے ہیں ۔اس مقصد کے لیے ان کی بڑی بڑی کانفرنسیں، جن کی سرپرستی حکومتیں کرتی ہیں، منعقد ہوتی رہتی ہیں۔وہ مطلوبہ مقاصد کے لیے اپنی حکمت عملی اور طریق کار میں تبدیلی کرنے سے بالکل نہیں چوکتے۔ ذیل میں ان کے بدلتے ہوئے طریق کار اور حکمت عملی کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

تجدد اور اصلاح مذہب کی تحریک:

تحریک استشراق کے آغاز سے تقریبا ڈیڑھ دو صدیوں تک ان کی حکمت عملی کے خطوط یہ رہے کہ مسلمانوں کو بدلو، ان کے مذہب پر حملے کرو اور لوگوں کو اسلام سے دور کرنے کے لیے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دو لیکن ایک طویل تجربے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ انہیں اپنی سابقہ حکمت عملی میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔اب انہیں مسلمانوں کو بدلنے کی بجائے تجدد و مغربیت اور اصلاح مذہب کی تحریک چلانی چاہیے۔اس سلسلہ میں مبشرین کے سب سے بڑے رہنما "سموئل زویمر" نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:"ہم نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے کثیر وقت اور سرمایہ صرف کیا ہے،بے شمار کتابیں تصنیف کیں لیکن ہمیں کچھ حاصل نہ ہوا۔اسلام سے صرف انہیں لوگوں نے رابطہ توڑ کر مسیحیت اختیار کی،جن کی اپنے نئے دین سے محبت خواہشات کی بنیاد پر تھی۔تاہم اس ناکامی پر عیسائی مبشرین کو مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہیے۔تمہارے لیے یہ کافی ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلامی عقیدے کو متزلزل کردو۔اگر تم ان کو اسلام کے متعلق متذبذب بنانے میں کامیاب ہو گئے تو یہی تمہاری کامیابی ہے،خواہ مسلمان عیسائیت کے حلقے میں داخل نہ ہوں "۔[77]معروف نو مسلم مصنفہ مریم جمیلہ اہل مغرب اور مستشرقین کی بدلتی ہوئی حکمت عملی سے متعلق رقمطراز ہیں:

"Since the second word war, the Orientalists and missionaries have shifted their efforts from trying to change individual Muslims and convert them to their views to changing Islam itself through providing it with a totally different interpretation and launching an organized movement for its reconstruction from within."[78]

چنانچہ مستشرقین نے اہل اسلام کو اسلام کی نئی تعبیر اور اصلاح مذہب کی دعوت دینا شروع کی۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مسلمانوں کو اگر ترقی کرنا ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کو نئے حالات کے مطابق ڈھالیں۔ یہاں کچھ مستشرقین کے خیالات پیش کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ وہ کس طرح مسلمانوں کو تجدد و اصلاح مذہب کی دعوت دیتے ہیں اور مسلمانوں میں اٹھنے والی "اصلاحی تحریکوں" اور "مصلح اشخاص" کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

فلپ کے ہٹی نے اپنی کتاب Islam and the West میں لکھا ہے کہ اسلامی قوانین مثلاً تعدد ازواج، چوری، جوا اور شراب وغیرہ کی سزائیں جدید اسلامی معاشرہ میں ناقابل عمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان پر عمل نہیں کیا جا رہا:

"Modern Islamic society has practically outgrown the Koranic legislation."[79]

Kanneth Cragg کہتا ہے کہ اسلام کو اپنی روح میں تبدیلی پیدا کرنی چاہیے ورنہ وہ نئی زندگی کا ساتھ نہ دے سکے گا:

"The modern mind is right in its instinctive awareness that Islam must either baptize change into its spirit or renounce its own relevance to life. Since it cannot do the later it must somehow do the former".[80]

مستشرقین بڑے جوش و خروش سے ان تجدد پسندوں کی تحسین کرتے ہیں، جو عیسائی اثرات کے زیر اثر ہیں۔ مسلم مصنفین میں سے چاہے کوئی مصنف کتنا ہی ناقابل اعتنا ہو، اسلام کی مخالفت کی وجہ سے ان کا محبوب قرار پاتا ہے۔ Cragg محمد کامل حسین کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جس نے حق کی حمایت میں آواز اٹھائی اور اس بات پر اصرار کیا کہ اسلام ہی سے اسلام کا غیر معتبر ہونا ثابت ہوتا ہے۔[81] وہ اپنی ایک دوسری کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ مسلمان وقت کے مطابق اسلامی احکامات میں از خود تبدیلی کرتے رہے ہیں، جس سے ایک طرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام کوئی مستقل دین نہیں تو دوسری طرف یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام کو ضرورت کے تحت

تبدیل کیا جا سکتا ہے۔[82] سمتھ اپنی کتاب Islam in Modern History میں کمالی اصلاحات کی نہایت تحسین کرتے ہوئے دوسرے مسلمانوں کو بھی ایسا ہی کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ ترکوں نے بجا طور پر محسوس کیا کہ اسلام اپنے وقت پر پروگریسو تھا مگر اب نہیں۔اب اسلام اور کسی بھی دوسرے مذہب کو زندہ رہنے کے لیے جدید تعلیم یافتہ انسان کے لیے قابل فہم ہونا چاہیے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھالے۔سمتھ کے نزدیک ان اصلاحات اور تبدیلیوں کا مطلب عیسائیت قبول کرنا نہیں بلکہ ماڈرن بننا ہے۔[83] سمتھ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کا حل سیکولرزم کو بتاتا ہے۔وہ کانگرسی مسلمان ابو الکلام آزاد وغیرہ کی تعریف کرتا اور تخلیق پاکستان کو ایک برائی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پاکستان جتنا زیادہ "اسلامی" ہوگا ہندوستانی مسلمان اتنے ہی زیادہ غیر محفوظ ہوتے جائیں گے۔[84]

ایک اور مستشرقS.D. Goitein کے نزدیک اسلام یہودیت سے مستعار لیا گیا ہے۔وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ عربوں کو مقامی زبانیں اپنانی چاہییں۔قرآن اس کے نزدیک جدید سوسائٹی کی ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔[85] یہودی مستشرقNadave Safran کو اسلام میں کچھ اچھائی نظر نہیں آتی۔وہ اسے ناقابل عمل اور غیر حقیقی کہتا ہے۔وہ رشید رضا کی خلافت سے متعلق کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ رشید رضا کو مسلمانوں کے سابقہ تجربات سے کچھ سبق نہ مل سکا۔[86] وہ مصری قومیت پسند سید لطفی سے اظہار ہمدردی کرتا ہے،جو تجدد کا بڑا نقیب اور اسلام کو چھوڑ کر فرعونیوں کی تقلید پر ابھارنے اور مصر میں نئی تعلیم اور نئے معتقدات اختیار کرنے اور پرانے اسلامی تصورات کو چھوڑنے کی ضرورت پر زور دینے والا تھا۔[87]

الغرض مستشرقین سر توڑ کوشش کرتے ہیں کہ اسلام کے چہرے کو بد نما بنا کر دکھایا جائے۔اسلامی ممالک کے وہ زعماء اور قائدین جنہوں نے یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی یا اسلام کا مطالعہ یورپین زبانوں میں کیا، ان کے دلوں میں اسلامی قانون و تہذیب کے سرچشموں سے متعلق شکوک و شبہات پیدا کیے جائیں اور ان کے دلوں میں اسلام کے مستقبل سے ناامیدی، حال سے بیزاری اور ماضی سے بدگمانی اس طرح پیدا کی جائے کہ ان کا سارا جوش وخروش دین کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے اور اسلامی قانون میں اصلاح و ترمیم کی مہم چلانے میں منحصر ہو کر رہ جائے۔[88]

مستشرقین نے تجدد و اصلاح مذہب کے نام سے مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کے لیے جس تحریک کا آغاز کیا تھا اس کے اثرات ظاہر ہو کر رہے۔ہر مسلم ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کا خاصا بڑا گروہ پیدا

ہوا، جنھوں نے انہی کے خیالات کو بنیاد بنا کر اسلام کا مطالعہ کیا اور انہی نتائج پر پہنچے، جو مستشرقین کو مطلوب تھے۔ اس گروہ کے اذہان میں اسلام کی قدرو منزلت کم ہو گئی ہے۔ یہ اپنے مذہب سے کٹ رہا ہے۔ یہ سمجھنے لگا ہے کہ اسلام میں اصلاح اور تجدد و تبدیلی سے منہ موڑ اگیا تو اسلام جدید دور کے لیے قابل عمل نہیں رہے گا۔

تشکیکی مواد کی فراہمی:

مستشرقین کے حکمت عملی اور طریق کار کا ایک پہلو اسلام سے متعلق تشکیلی مواد کی فراہمی ہے۔ قرآن مجید، سیرت نبوی ﷺ، فقہ و کلام، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین و فقہا، مشائخ و صوفیہ، رواۃ حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، حدیث کی صحت، تدوین حدیث، فقہ اسلامی کے مآخذ اور اس کا ارتقاء، ان میں سے ہر موضوع کے متعلق مستشرقین کی کتابوں اور تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے، جو ایک ایسے ذہین اور حساس آدمی کو، جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو، پورے اسلام سے منحرف کر دینے کے لیے کافی ہے۔[89] یہ لوگ پڑھے لکھے، حوصلہ پسند اور ترقی پسند نوجوان قارئین کے سامنے بار بار اور مختلف عنوانات کے تحت اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔ ان کا اندازہ اس قدر موثر ہوتا ہے کہ ان نوجوان قارئین کا ذہن اسی پیش کردہ تشکیکی مواد کو بدیہی حقیقت کی طرح قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ محمد البہی کے الفاظ میں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ کی اسلام کے ساتھ وابستگی محض ایک مختصر وقفہ میں مستحکم رہی۔ یہ وہ تاریخی وقفہ ہے جبکہ اسلامی معاشرہ ابتدائی حالت اور عہد طفولیت میں تھا۔ اس مختصر وقفہ کے ختم ہوتے ہی اسلامی معاشرہ اور اسلام کے درمیان خلیج پڑ گئی۔ اسلام رفتہ رفتہ بدلتی ہوئی اور ترقی کرتی ہوئی زندگی کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ خلافت اسلامی کے آخری مرکز جدید ترکی نے اسلام کو فرد کا ذاتی معاملہ قرار دیتے ہوئے عام زندگی سے بے دخل کر دیا۔ نئے دور میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور دینے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے، تمدن جدید کے وسائل سے استفادہ کرنے میں مسلمان دنیا سے پیچھے رہ جائیں اور مسلمان ممالک میں غربت، بیماریوں اور جہالت کو بخوشی گوارا کر لیا جائے۔ تغیر و ترقی کا وہ اصول جس سے کوئی مفر نہیں اہل اسلام کو اسلام پر بھی لاگو کرنا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ گردش زمانہ کے ساتھ ساتھ اسلام کو بھی بدلیں۔ اہل مغرب کی پیروی کریں اور ان کے ان تجربات سے مستفید ہوں، جو طویل انسانی تجربوں کا نتیجہ اور انسانی فلاح و ترقی کا واحد راستہ ہیں۔[90]

مستشرقین نے مسلمانوں کے یقین کو کمزور کرنے اور تشکیک کا زہر پھیلانے کے لیے اسلامی تحقیق کے

نام پر کروڑوں ڈالر خرچ کر کے تشکیکی مواد تیار کیا۔[91] McGill یونیورسٹی کے ذمہ خصوصی طور پر یہ کام لگایا گیا ہے کہ وہ ایسے اسلامسٹIslamist پیدا کرے جو مسلمانوں کے عقائد و ایمانیات سے متعلق سمجھوتے کی فضا پیدا کریں۔صدیوں کی مخاصمت کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اصولوں کی بنیاد پر اسلام کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔اسلام میں ایک ایسی مقناطیسی طاقت ہے،جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ لہٰذا اہل مغرب کو اسلام سے دوررکھنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ زہریلا لٹریچر گردش کرتا رہے اور اسلام سے متعلق متعصبانہ پروپیگنڈہ کیا جاتا رہے۔[92] تشکیکی مواد اور زہریلے لٹریچر کے سلسلہ میں مستشرقین کی حکمت عملی بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی، یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں زہر کی ایک مناسب مقدار رکھتے ہیں اور اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ تناسب سے بڑھنے نہ پائے،اور پڑھنے والے کو متنفر اور بدگمان نہ کر دے۔ ان کی یہ تحریریں اس قدر خطرناک ہوتی ہیں کہ ایک متوسط آدمی کا ان کی زد سے بچ نکلنا مشکل ہوتا ہے۔[93]

اسلامی تہذیب و تاریخ اور اقدار و شخصیات کی تحقیر:

مستشرقین کی حکمت عملی اور طریق کار کا ایک رخ اسلامی تہذہب و تاریخ اور اقدار شخصیات کی تحقیر اور ان سے متعلق بدگمانیاں پیدا کرنا بھی ہے ظفر علی قریشی کے الفاظ میں:

> "The device of these imperial agents has generally been to criticize the religion and culture of the conquered peoples, to malign the founders of their faiths and leaders of their thought, to cast aspersion on their holy books, to put to obloquy and derision the tenets of their creed, to denounce their sires and forbears, to condemn their heritage of culture and traditions, to revile what they hold dear and precious, and to create doubts and misgivings about their traditions, culture and civilization and their future- thus paving the way for the acceptance of Christian dogmas and ideology, and ultimately, the domination of Western culture and civilization."[94]

مستشرقین کا ایک گروہ اسلامی تہذیب کی تحقیر میں مصروف رہتا ہے۔ یہ عربوں کے تمدنی محاسن کا استخفاف اور نوجوان نسل کے دلوں سے اسلامی تہذہب کی قدرومنزلت کو محو کر دینا چاہتا ہے۔امریکہ اور فرانس وغیرہ کی یونیورسٹیاں اس گروہ کے نظریات کی اشاعت کا مرکز بنی ہوئی ہیں، جہاں طلبہ کو اول روز ہی سے یہ تربیت دی جاتی ہے کہ وہ تہذیبی و ثقافتی مظاہر کو عربی الاصل ثابت کرنے کی بجائے لاطینی الاصل ثابت کریں، تاکہ علم و فکر کے رشتے اور عقیدت و محبت کے جذبات مسلمانوں سے کٹ کر قدیم

لاطینی اور یونانی اقوام کے ساتھ منسلک ہو جائیں۔[95] مستشرقین نے جہاں تغیر و ترقی کے نام پر خدا کے آخری اورابدی دین اور قانون پر عمل کو روایت پرستی، رجعت پسندی اور قدامت و دقیانوسیت کا مترادف قرار دیا، وہاں ان قدیم ترین تہذیبوں اور قدیم زبانوں، جو کہ اپنی زندگی کی صلاحیت اور ہر طرح کی افادیت کھو کر ماضی کے ملبے نیچے سینکڑوں ہزاروں برس سے مدفون ہیں، کے احیاء کی دعوت دی۔اس سلسلہ میں انہوں نے مسلم ممالک میں اپنے نظریات کا حامی ایک خاصا بڑا طبقہ پیدا کر لیا۔مستشرقین اور ان کے ہمنوا مسلمانوں کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں علاقائی تہذیبیں اجاگر کی جائیں۔اور یوں اسلامی تہذیب کی وحدت کے تصور میں رخنہ ڈالا جائے۔مستشرقین اور ان کے شاگردوں نے شدومد سے یہ بھی کہنا شروع کیا کہ قرآنی عربی زبان "فصحیٰ" اس زمانہ کی ضروریات کوپورا نہیں کر سکتی۔لہذا اس کی بجائے عامی اور مقامی زبانوں کو رواج دینا چاہیے اور انہی کو اخبارات اور کتابوں کی زبان بنانا چاہیے۔حالانکہ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہر ملک اور صوبہ کی الگ الگ زبان ہو جائے اور عرب قوموں کا رشتہ قرآن مجید اور اسلامی ادب سے کٹ جائے،عربی زبان اپنی بین الاقوامی حیثیت ختم کر دے اور عرب پورے دینی سرمایہ اور روح سے محروم ہو کر الحاد و ارتداد اور اختلاف و انتشار کا شکار ہو جائیں۔عربی رسم الخط کی بجائے لاطینی رسم الخط کی دعوت کے پیچھے بھی یہی مقاصد کارفرما تھے کہ پوری عرب قوم قرآن سے نا آشنا اور اپنے بے نظیر علمی ذخیرے سے لا تعلق ہو کر رہ جائے۔[96]

مستشرقین کو مسلمانوں میں تجدد و اصلاح مذہب کی تحریک چلانے، اسلام سے متعلق تشکیکی مواد فراہم کرنے اور اسلامی تہذیب و تاریخ اور اقدار و شخصیات کی تحقیر کی حکمت عملی اور طریق کار سے جو مقاصد مطلوب تھے ان میں انہیں خاصی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔عالم اسلام میں اصلاح و ترقی کے نام پر تجدد و مغربیت کے جتنے علمبردار پیدا ہوئے ان کے تصورات و خیالات پر مستشرقین کی چھاپ واضح دکھائی دیتی ہے۔

مستشرقین اور اہل اسلام:

اس بحث سے قطع نظر کہ مستشرقین نے اسلام کو بجائے خود یا بحیثیت دین کیا نقصان پہنچایا ہے۔یہاں اس حقیقت کااظہار ضروری ہے کہ انہوں نے مسلم معاشروں میں مسلم زعماء اور ارباب حکومت و اقتدار اور مسلم علماء و اہل فکر و نظر پر خاصا اثر ڈالا ہے۔جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، یہ کہنا بالکل غلط نہ ہو گا کہ مستشرقین کو مسلمانوں میں تجدد و اصلاح مذہب کی تحریک چلانے، اسلام سے متعلق تشکیکی مواد فراہم کرنے اور اسلامی تہذیب و تاریخ اور اقدار و شخصیات کی تحقیر کی حکمت عملی سے جو مقاصد مطلوب تھے،

وہ ان میں خاصی حد تک کامیاب رہے۔عالم اسلام میں اصلاح و ترقی کے نام پر تجدد و مغربیت کے جتنے علمبردار پیدا ہوئے، ان کے افکارو تصورات پر مستشرقین کی چھاپ واضح دکھائی دیتی ہے۔ان استشراقیت زدہ مسلمانوں میں اہل اقتدار، مسلم زعما اور طبقہ امراء تو اکثر و بیشتر شامل ہے ہی، نام نہاد مسلم سکالرز اور دانشوروں کی بھی ایک بڑی تعداد اس مرض کی مریض ہے۔عالم اسلام میں جہاں تک اہل قوت و اقتدار کا تعلق ہے تو وہ بقول مریم جمیلہ، اکثر وبیشتر اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ اصلی اسلام کی بجائے مستشرقین اور عیسائی مشنریوں کا لندن اور امریکہ میں تیار کردہ اسلام کا ایک لبرل، ترقی پسنداور جدید ایڈیشن پیش کیا جائے۔[97] چنانچہ مسلم معاشروں میں مغربی طرز فکر پر اصلاح و ترقی کے خواہاں زعما اور حکمرانوں نے اپنے معاشروں کو مغربی رنگ میں رنگنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ترکی کا قوم پرست لیڈر ضیا گوک الپ یورپ کی مکمل نقل کا خواہاں تھا۔یہاں تک کہ اس کے نزدیک وطنیت اور حب الوطنی کے مقابلہ میں اخلاقیات کی کچھ اہمیت نہ تھی۔مصطفی کمال اتاترک ترکی میں تجدد و مغربیت کا سب سے بڑا نقیب بن کر سامنے آیا۔اس نے حصول اقتدار کے بعد اسلام کو ترکوں کی زندگی سے بے دخل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔یہ بات صرف ضیا گوک الپ یا مصطفی کمال تک محدود نہیں بلکہ عالم اسلام کا تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ، مقتدر اور صاحب اختیار طبقہ اسی روش کا پیرو ہے۔جمال عبدالناصر ہو یا رضا شاہ پہلوی،احمد سائیکارنو ہو یا حبیب بورقیبہ، احمد بن بلاہو یا معمر قذافی اور حامد کرزئی ہو یا پرویز مشرف تقریباً تمام مسلم قیادت تجدد و مغربیت ہی کو کامیابی کا واحد راستہ سمجھتی ہے۔

حکمران اور طبقہ امراء کے علاوہ ہمارے بہت سے نام نہاد سکالرز اور دانشور بھی مغرب کی نقالی میں حکمران طبقے سے جوہری اعتبار سے کچھ زیادہ مختلف الخیال نہیں ہیں۔سر سید احمد خاں ہوں یا مولوی چراغ علی،مرزا قادیانی ہو یا محمد علی لاہوری، ڈاکٹر فضل الرحمن ہوں یا غلام احمد پرویز، مفتی محمد عبدہ ہوں یا سید رشید رضا،علی عبدالرزاق ہوں یا ڈاکٹر طہ حسین، سب مسلمانوں کی ترقی وکامرانی تجدد و مغربیت ہی میں دیکھتے ہیں۔

یہاں مختصراً یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ مستشرقین اور مسلم تجدد پسندوں کی طرف سے مسلمانوں کو حقیقی اسلامی تعلیمات سے دور لے جانے کے لیے جو بھی کاوشیں ہوئیں اور جو لٹریچر بھی تخلیق ہوا،اہل اسلام کے راسخ العقیدہ اور رسوخ فی العلم رکھنے والے طبقہ نے اس سے آنکھیں بند نہیں کیں، بلکہ پوری جانفشانی اور مستعدی سے اپنی بساط کے مطابق اس لٹریچر کا جواب دینے کی قابل قدر کاوشیں کیں۔ایسے علماء اور دانشوروں کی ایک قابل لحاظ تعداد موجود ہے، جنہوں نے مستشرقین کے اعتراضات

سے اسلام کا دفاع کرنے اور ان کے شاگرد مسلم دانشوروں کی کوتاہ اندیشوں سے اسلام کے چہرہ صافی پر ابھرنے والے دھبوں کو دھونے کے لیے قابل داد وتعریف کام کیا۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ کام مطلوبہ ضرورت کے اعتبار سے ناکافی ہے اور اس سلسلہ میں مزید بہت زیادہ کام کی ضرورت ہے۔

خلاصۂ بحث:

مستشرقین، تحریک استشراق اور اسلام کے عنوان کے تحت کی جانے والی اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ تحریک استشراق ایک منظم تحریک ہے۔ جو مشرقی اقوام خصوصاً ملت اسلامیہ کے مذاہب، زبانوں، تہذیب و تمدن، تاریخ و ادب، انسانی قدروں، ملی خصوصیات، وسائل حیات اور امکانات کا مطالعہ معروضی تحقیق کے لبادے میں اس غرض سے کرتی ہے کہ ان اقوام کو اپنا ذہنی غلام بنا کر ان پر اپنا مذہب اور اپنی تہذیب مسلط کرے اور ان پر سیاسی اور تہذیبی غلبہ حاصل کر کے ان کو مغلوب و مقہور رکھے اور ان کے وسائل حیات کا استحصال کرے۔اس تحریک کے وابستگان اپنے مخصوص ذہنی پس منظر کی بنا پر اسلام اور پیغمبر اسلامؐ سے بغض و عناد اور نفرت و عداوت سے مملوجذبات کے حامل ہیں۔ یہ لوگ اکثر و بیشتر یہود ونصاریٰ ہیں۔یہود و نصاریٰ کی اسلام اور مسلم دشمنی روز اول ہی سے جانی بوجھی ہوئی تھی۔ لیکن صلیبی جنگوں کی شدید ترین اور غیر مختتم تلخیوں نے اس موروثی وازلی اسلام دشمنی کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ ابتدا میں تو یہ دشمنی گالیوں اور یاوہ گوئیوں کا سا انداز لیے ہوئے تھی،جیسا کہ کامیاب دشمن کے مقابلہ میں ناکام دشمن کا بالعموم وطیرہ ہوا کرتا ہے۔بعد ازاں جب اہل مغرب کو سیاسی و مادی غلبہ حاصل ہوا،تویہ اسلام دشمنی ایک باقاعدہ سائنس کی شکل اختیار کر گئی اور علمی تحقیق کے نام پر اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف کیچڑ اچھالنے کا بیڑا اٹھا لیا گیا۔ان علمی و تحقیقی سرگرمیوں کی حکومتوں کی جانب سے باقاعدہ پشت پناہی کی گئی۔ مخصوص اہداف و مقاصد کی خاطر جن میں مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور علمی وغیرہ مقاصد شامل تھے، کے حصول کے لیے مختلف طریقہ ہائے کار اور حکمت ہائے عملی سے کام لیا گیا۔ کبھی عیسائیت کی تبلیغ اور اشاعتِ اسلام کو روکنے کی کاوشیں ہوئیں۔ کبھی مسلمانوں کو تجدد و اصلاح مذہب کی طرف بلایا گیا۔ کبھی اسلام سے متعلق تشکیکی مواد فراہم کیا گیا۔اور کبھی اسلامی تہذیب و تاریخ اور اقدار و شخصیات کی تحقیر کی گئی۔اسلام اور پیغمبر اسلام کی مسخ شدہ تصویر پیش کرنے کی غرض سے کمزور اور ثانوی مآخذ کو بنیاد بنایا گیا،اور قوت تخیل سے کام لے کر معروضی تحقیق کے نام پر غیر معروضی تحقیق کی گئی۔ اپنے ذہن میں بنائے ہوئے خاکے کو رنگ و روغن اور نقش و نگار سے مکمل کرنے میں بڑی سرگرمی اور مستعدی سے کام لیا گیا اور اپنے تعصب کی بنا پر غلط نتائج اخذ کر کے قارئین

کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے متنفر کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ چونکہ وابستگان تحریک استشراق اپنی غیر معروضی تحقیقات پر اپنے ہم مذہبوں کی مادی و سائنسی اور تہذیبی و علمی ترقی کے تناظر میں معروضی تحقیق کا لیبل چسپاں کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے تھے، لہذا مسلم زعماء اور اہل فکر و دانش کی ایک بڑی تعداد ان کے دام ہم رنگ زمیں کا شکار ہو کر انہی کا راگ الاپنے لگی۔ تاہم بعض دیگر پختہ فکر اور راسخ العقیدہ علماء نے استشراقی تحقیقات کی صحیح نوعیت کا ادراک کرتے ہوئے ان کے اعتراضات کے جوابات اور ان کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کے ازالے کی مقدور بھر کوششیں کیں۔

حواشی و حوالہ جات

[1]۔ شرف الدین اصلاحی، ڈاکٹر، 'مستشرقین، استشراق اور اسلام'، در ماہنامہ 'معارف'، اعظم گڑھ، ستمبر 1982، ص165-166۔

[2]Encyclopaedia Bretannica, U.S.A. 1961, Vol. 9, P. 71.

[3]The Oxford English Dictionary, Clarendon Press, Oxford, 1989, Vol. X, P. 930.

[4]The Oxford Illustrated Dictionary, Oxford University Press, 1978, P. 1188.

[5] The Oxford English dictionary, Vol. X, P. 931.

[6]The Heritage Illustrated Dictionary of the English language, New York, 1973, P. 926.

[7]The Oxford Illustrated dictionary, P. 1188

[8]۔ لویس معلوف المنجد، دار المشرق، بیروت، 1967، ص947۔

[9]۔ جبران مسعود، الرائد، معجم لغوی عصری، بیروت، 1967، ص1372۔

[10]۔ المنجد، حوالہ مذکور، ص65۔

[11]۔ الرائد، حوالہ مذکور، ص109۔

[12]۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر) کراچی، اردو لغت بورڈ، 2002، جلد ہژدھم،، ص2۔

[13]۔ جامع اللغات، اپرمال، لاہور: سن طبع نامعلوم، ص1825۔

[14]۔ اردو لغت، حوالہ مذکور، ص2۔

[15]۔ دیاب، محمد احمد، دکتور، اضواء علی الاستشراق والمستشرقین، قاہرہ، دار المنار، 1989، ص10۔

[16]۔ اللبان، ابراہیم عبد المجید، المستشرقون والاسلام، مجمع البحوث الاسلامیۃ، أبریل 1970، ص5-4

[17]۔ شرف الدین اصلاحی، ڈاکٹر، حوالہ مذکور، ص168۔

[18]۔ ایضاً، ص167-166۔

[19]Said, Edward W, Orientalism, London, Routledge and Kegan Paul, 1978, P.2.

[20]۔ شرف الدین اصلاحی، ڈاکٹر، حوالہ مذکور، ص171-165۔

[21]۔ الفیومی، محمد ابراہیم، دکتور، الاستشراق رسالۃ الاستعمار، قاہرہ، دار الفکر العربی، 1993، ص144۔

[22]۔ استشراق اور مستشرقین کی متنوع تعریفات کی تفصیلات کے لیے مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: یحیٰ مراد، الدکتور، افتراءات المستشرقین علی الاسلام والرد علیھا، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، 2004، ص-17-7-

[23]Zaehner R.C. At Sunday Times, London, 1958, P.193; Lootfy Levonian, Studies in Relationship between Islam and Christianity, London, 1940, P. 109.

[24]Wright, Thomas, Early Christianity in Arabia, London, 1855, P. 152
[25]Hitti, P. K. History of the Arabs, London, Macmillan 1968, P. 147.
اس سلسلہ میں J. J. Saunders بھی ہٹی کا ہمنوا ہے۔ ملاحظہ ہو:
Saunders, J. J., A History of Medieval Islam, London, Routledge and Kegan Paul, 1965, P. 14.
[26]Gibben, Edward, The decline and fall of the Roman Empire, New York,The Modern Library edition, Vol. II. P. 688.
[27]Mills, Charles, Mohammadanism, London, 1817, P. 29.
[28]Mills, Charles, Mohammadanism, London, 1817, P. 29.
[29]۔ پیر کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی، جلد ششم، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ، 1417ھ، جلد ششم، ص46-43۔
[30]۔ ایضاً، ص82-80۔
[31]Kirby Page, Jesus or Christianity, New York, 1929, P. 97.
[32]۔ السباعی، محمد مصطفی، الدکتور، السنۃ و مکانتھا فی التشریع الاسلامی، القاہرہ، مکتبہ دار لعروبہ شارع الجمہوریہ، 1961، ص32-31۔
[33]Zafar Ali Qureshi, Prophet Muhammad and his Western Critics, Lahore, Idara Ma,arif Islami, Mansoora, 1992, Vol. I. P. 1-2.
[34]Loon, Handrik Van, Tolerance, New York, The Sun Dial Press, 1939, P.114.
[35]۔ السباعی، محمد مصطفی، الدکتور، المرجع السابق، ص32۔
[36]۔ ایضاً، ص33-32۔
[37]۔ الفیومی، محمد ابراہیم، دکتور، المرجع السابق، ص142۔
[38]۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: نجیب العقیقی، المستشرقون، دارالمعارف بمصر، 1، 1964، ص137-120، جلال مظہر، کتاب العمل، 1969، الحضارۃ الاسلامیۃ، ص124، دیاب، محمد احمد، دکتور، المرجع السابق، ص13۔
[39]۔ محمد البہی، الفکر الاسلامی الحدیث وصلتہ بالاستعمار الغربی، بیروت، دار لفکر، ص-532
[40]۔ زقزوق، محمود حمدی، دکتور، الاستشراق والخلفیۃ الفکریہ للصراع الحضاری، قاہرہ: دارالمنار، 1989، ص25۔
[41]۔ حبیب الحق ندوی، پروفیسر، سید، اسلام اور مستشرقین، درماہنامہ، 'معارف'، اعظم گڑھ، مئی 1983، ص332۔
[42]۔ دیاب، محمد احمد، دکتور، المرجع السابق، ص15۔
[43]۔ حبیب الحق ندوی، پروفیسر، سید، حوالہ مذکور، ص333-332۔
[44]۔ ایضاً، ص334-333۔
[45]۔ ایضاً، ص336-335۔
[46]۔ دیاب، محمد احمد، دکتور، المرجع السابق، ص18۔
[47]۔ زقزوق، محمود حمدی، دکتور، المرجع السابق، ص32۔
[48]۔ دیاب، محمد احمد، دکتور، المرجع السابق، ص23۔-24
[49]۔ الجبری، عبدالمتعال محمد، دکتور، الاستشراق، وجہ للاستعمار الفکری، قاہرہ، مکتبہ وہبہ، 1995، ص، 55، زقزوق، محمود حمدی، دکتور، المرجع السابق، ص36-35۔
[50]۔ حبیب الحق ندوی، پروفیسر سید، حوالہ مذکور، ص343-341۔
[51]۔ شبلی نعمانی، مولانا، سیرت النبی، لاہور: جلد اول، الفیصل ناشران و تاجران کتب اردو بازار، 1991ص، 67-66۔
[52]Watt, Montgomery, Muhammad: Prophet and Statesman, Oxford University Press.
[53]Hitti, Philip, K, Islam a Way of life, Oxford University Press, 1971, PP. 22-23.
[54]Armstrong, Keren, Muhammad: A Western Attempt to understand Islam, London 1991, PP.22-24

55- حبیب الحق ندوی، پروفیسر سید، حوالہ مذکور، ص352-348۔
56- شبلی نعمانی، مولانا، حوالہ مذکور، ص68۔
57- حبیب الحق ندوی، پروفیسر، سید، اسلام اور مستشرقین، در ماہنامہ "معارف"، اعظم گڑھ، جون 1983، ص414-410۔
58- خلیق احمد نظامی، پروفیسر، مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور، مشمولہ، اسلام اور مستشرقین، اعظم گڑھ، 1986، جلد2، ص16، نیز ملاحظہ ہو :
Yusuf-ud-Din, Oriental and Islamic Studies in World Universities, Daccan, India, Islamic Publications, N. D. PP. 80-120
59- الجبری، عبد المتعال محمد، دکتور، المرجع السابق، ص83-82۔
60 - Michael-D-Lemonick, Are the Bible Stories True? Time Asia, New York, 18 December, 1995, P. 48.
61- الجبری، عبد المتعال محمد، دکتور، المرجع السابق، ص13۔
62- پیر کرم شاہ الازہری، حوالہ مذکور، ص245۔
63- الدھان، محمد محمد، قوی الشر المتحالفہ وموقفھا من الاسلام والمسلمین، القاہرہ: دار الوفا للطباعۃ والنشر المنصورہ، ص124۔
64- الجبری، عبد المتعال محمد، دکتور المرجع السابق، ص158۔
65 - Said, Edward, W, Op.Cit. Pp. 201-204.
66- ابو الحسن علی ندوی، مولانا، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، کراچی: مجلس نشریات اسلام، 1981، ص257-256۔
67- روزنامہ جنگ، لاہور، 6 جنوری 2006۔
68- محمد امین، ڈاکٹر، روشن خیالی کی امریکی اساسات، در روزنامہ نوائے وقت، لاہور، 9-8 اگست 2006۔
69- حامدی، خلیل احمد (مرتب)، نظام اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں، لاہور: اسلامک پبلیکشنز، 1963، ص437۔
70- السباعی، محمد مصطفی، ڈاکٹر، 'المستشرقون والاسلام (اردو ترجمہ از مولانا سلیمان شمسی ندوی)، لاہور، ادارہ اسلامیات، 1982، ص36-34۔
71- الجبری، عبد المتعال محمد، دکتور، المرجع السابق ص76۔
72- پیر کرم شاہ الازہری، حوالہ مذکور، ص279-278۔
73- الجبری، عبد المتعال محمد، دکتور، المرجع السابق، ص108۔
74- ابو الحسن علی ندوی، مولانا، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص257۔
75- السباعی، محمد مصطفی، ڈاکٹر، المستشرقون والاسلام، حوالہ مذکور، ص35-34۔
76- ابو الحسن علی ندوی، مولانا، حوالہ مذکور، ص136۔
77- الدھان، محمد محمد، المرجع السابق، ص136۔
78 - Maryam Jameela, Islam and Orientalism, Lahore, Sant Nagar, 1971, P. XXIII.
79 - Hitti, Philip. K., Islam and the West, New Jersey, 1962, P. 21.
80 - Kenneth Cragg, The Call of Minaret, New York, Oxford University Press, 1956, P17.
81 - Kenneth Cragg, Islamic Surveys-3: Counsels in Contemporary Islam, Edinburgh, Edinburgh University Press, 1965, P. 107.
82 - Idem, The Dome and the Rock: Jerusalem Studies in Islam, S. P.C. K; London, 1964, P. 135.
83 - Smith, Welfred Cantwell, Islam in Modern History, New Jersey, Princeton University Press, 1957, PP. 178- 204.
84 - Ibid. PP. 273-274.

[85] - Goitain, S. D, Jews and Arabs: Their Contacts through the Ages, New York, Schockan books, 1955, PP. 129-130

[86] - Nadave Safran, Egypt in Search of Political Community: An Analysis of the Intellectual and Political Evolution of Egypt: 1804-1952. Cambridge, Havard University Press, 1961, P. 80.

[87] - Ibid. PP. 95-97.

[88]۔ ابوالحسن علی ندوی، مولانا، اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین، کراچی، مجلس نشریات اسلام، 1992، ص14۔

[89]-ابوالحسن علی ندوی، مولانا، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، حوالہ مذکور، ص260۔

[90]-ایضاً، ص263-260۔ بحوالہ، محمد البہی، الفکر الاسلامی الحدیث۔

[91]۔ افغانی، شمس الحق، مولانا، علوم القرآن، لاہور: امجد اکیڈمی، س۔ن۔ ص120۔

[92]Muammad Imran, Maulana, Distortions about Islam in the West, Lahore, Malik Siraj and Sons, 1979, P. 13.

[93]۔ ابوالحسن علی ندوی، مولانا، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص 259۔

[94]Zafar Ali Qureshi, Prophet Muhammad and his Western Critics. Vol: I, P. 4.

[95]-حامدی، خلیل احمد، نظام اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں، ص452۔

[96]-ابوالحسن علی ندوی، مولانا، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص266-265۔

[97] - Maryam Jameelah, Islam and Modernism, Lahore, 1977, P. 239.